اردو ریسرچ جرنل

Urdu Research Journal

Vol.II, ssue:I,Jan.-March. 2015

سرپرست

پروفیسر ابن کنول

مدیر اعلیٰ

عزیر اسرائیل

مجلس مشاورت

☆ڈاکٹر محمد رضی الرحمن (گورکھپور)

☆ڈاکٹر محمد شمیم خان (ساگر)

☆ڈاکٹر محمد اکمل (لکھنؤ)

☆سہیل انجم (دہلی)

☆ڈاکٹر صابر گودڑ (موریشش)

☆خان جلال الدین (ممبئی)

☆محمد شمس الدین (دہلی)

ISSN. 2348-3687

اپنی نگارشات اس پتہ پر ارسال کریں:

B-4, Joga Bai, Near Rahmani Masjid, Opp. Fiqh Academy, Jamia Nagar, New Delhi-110025

editor@urdulinks.com /

urjmagazine@gmail.com

Web: www.urdulinks.com/urj

فہرست مضامین

ادارایہ

ہنگاموں کے بیچ کی خاموشی — عزیر اسرائیل (مدیر) 2

تنقید وتحقیق

اقبال اور تصوف– تطبیق کا مسئلہ — ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور 4

اردو مرثیہ میں رزم نگاری — پروفیسر ابن کنول

صدر شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی 10

اسلامی ثقافت کی تشکیل میں ہندوستانی ثقافت کے عناصر

ڈاکٹر جعفر احراری

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج 15

اردو میں ادبی ترجمے کی روایت — ڈاکٹر احمد امتیاز

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی 20

اردو اخبارات ایک قدم آگے دو قدم پیچھے — عزیر اسرائیل

شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی 27

انسانیت کا نوحہ گر افسانہ نگار اقبال متین — احمد علی جوہر

ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو، دہلی 30

برج پریمی کی ادبی خدمات — سرتاج احمد بدرو

کشمیر یونی ورسٹی، کشمیر 33

علی سردار جعفری کے تنقیدی افکار — محمد قمر

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 39

اردو کے مختلف نام — کوثر جہاں

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 44

حیدرآباد کی جامعات میں اردو تحقیق کی رفتار

خاتون محققین کے حوالے سے۔ایک جائزہ — شاہانہ مریم

یونی ورسٹی آف حیدرآباد 47

صوفیا کی خدمات

سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصنیفات پر ایک نظر، پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی

خواجہ معین الدین چشتی یونی ورسٹی، لکھنؤ 60

کسوٹی (تبصرۂ کتب)

راجندر یادہ کی منتخب کہانیاں (ترجمہ) — عزیر اسرائل 63

نوٹ: مضمون نگار کی آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالتوں میں کی جاسکتی ہے۔

ہنگاموں کے بیچ کی خاموشی

سال 2014 رخصت ہوگیا، نئے سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ سالِ گزشتہ میں ہم نے کیا کیا اور آنے والے سال میں ہمیں کیا کرنا ہے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے اپنے اپنے انداز میں محاسبہ کرتے ہیں۔ ادب کے قاری ہونے کی وجہ سے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ سالِ گزشتہ میں ہماری ادبی سرگرمیاں کیا رہی ہیں۔ کون سی ایسی معرکتہ الآرء کتاب سامنے آئی جس کے دوررس اثرات آنے والے دنوں میں محسوس کیے جائیں گے۔ ایک سال کی مدت بہت زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ شاہکار تخلیقات برسوں میں سامنے آتی ہیں۔ ہر سال 'آگ کا دریا' یا 'شعر شور انگیز' جیسی کتابیں سامنے نہیں آتیں۔ گزشتہ سال بہت ہنگامہ خیز تھا۔ حالی اور شبلی صدی تقریبات پورے برصغیر ہندو پاک میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منائی گئیں۔ خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کی صدی تقریبات بھی پورے اہتمام کے ساتھ منائی گئیں۔ رسالوں نے خصوصی نمبرات شائع کیے۔ ان کی یاد میں محفلیں منعقد کی گئیں۔ یہ وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا ثانی تاریخ نہیں پیش کرسکی۔ حالی اور شبلی نے اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔ اردو نثر کو سوانح نگاری اور تاریخ نگاری کا ہنر سکھایا۔ جب کہ کرشن چندر خواجہ احمد عباس نے اردو فکشن کو وقار بخشا۔ اردو کی ان عظیم شخصیات کو یاد کرتے وقت ہماری گردنیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں۔ یہ ساری ادبی سرگرمیاں لائق ستائش ہیں لیکن کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ ہماری ساری کوششیں سمٹ کر مرحومین کی یاد آوری تک رہ گئی ہیں؟ ان کی یاد میں بڑے بڑے سمینار، اور اس کے بعد خاموشی۔ اس سے نہ اردو ادب کا بھلا ہوا ہے اور نہ ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے سردار جعفری کو یاد کیا تھا اس سے بھی پہلے فیض اور منٹو کو اتنے ہی جوش وخروش کے ساتھ یاد کیا گیا تھا۔ نئے سال میں ہم اردو والے کسی اور اہم ادیب کی صد سالہ جشن منانے میں مصروف ہو جائیں گے۔ کیا کبھی ہم نے سوچا کہ ان سمیناروں پر جو لاکھوں روپئے خرچ ہوتے ہیں ان کا فائدہ اردو زبان وادب کو ملتا ہے؟ ہم نے حالی اور شبلی کی صد سالہ تقریبات منائی اور ان کے اس اہم پیغام کو بھلا دیا کہ ماضی کو یاد کرنے سے زیادہ اہم کام مستقبل کے لیے لائحۂ عمل تیار کرنا ہے۔ وہ لوگ ماضی میں نہیں حال میں جیتے تھے اور مستقبل کی تعمیر کرتے تھے۔ یہ انہیں بزرگوں کا قول ہے کہ یاد ماضی انہی اقوام کے لیے مفید ہے جو اس سے سبق لے کر اپنے مستقبل کو سنواریں۔

برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان کی صورتحال کوئی بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اسکولوں سے اردو ختم ہوتی جارہی ہے۔ ملک کے بیشتر کالجوں میں اردو اساتذہ اردو ڈپارٹمنٹ کو ساتھ لے کر ریٹائر ہو رہے ہیں۔ جی ہاں، اتر پردیش اور ملک کے دوسرے حصوں کے اکثر کالجوں میں جہاں اردو زبان کی تدریس ہوتی تھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی ہے۔ پرانے اساتذہ کے ریٹائر ہوتے ہی وہاں سے اردو زبان کا صفایا کردیا جاتا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ مسلمان کوئی زبان جانے یا نہ جانے اردو ضرور جانتا ہے اب یہ بات بھی غلط ہوگئی ہے۔ اردو کی قدیم آبادیوں سے بھی اردو بے دخل ہو رہی ہے۔ انہیں کوئی اردو سکھانے والا نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم ہنگامہ آرائی کے بجائے اردو سناشی کی مہم شروع کرتے۔ لوگوں کے بیچ میں جا کر انہیں اردو زبان کی اہمیت بتاتے۔ انہیں سمجھاتے کہ اردو سے عدم واقفیت کی وجہ سے وہ کیا کھو رہے ہیں؟ دہلی کے مختلف علاقوں میں قائم اردو خواندگی مرکز اردو سناشی میں ایک کردار ادا کررہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے ان مراکز کو اور فعّال بنایا جائے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ملک کی دوسری اردو اکامیاں بھی اردو کے لیے اسی قسم کا پروگرام بناتیں۔

اردو کو فروغ دینے کے لیے آج جس قسم کی کوششیں ہو رہی ہیں وہ شاخوں کو پانی دینے کے مترادف ہے۔ اللہ کے واسطے اس رویہ میں تبدیلی لائیں۔ اردو کے بنیادی مسائل پر توجہ دیں۔ سمینار جلسے جلوس سب اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ اہم کام اردو خواندگی کو فروغ دینا ہے۔ جن اسکولوں اور کالجوں سے اردو بے دخل ہو رہی ہے وہاں اسے دوبارہ بحال کرنا ہے۔ نئے اسکولوں اور کالجوں میں اردو کو داخل کرنا ہے۔ اگر ہم نے اردو کے ان بنیادی مسائل پر توجہ نہ دی تو آنے والا مؤرخ لکھے گا کہ 'روم جل رہا تھا اور پیرو بانسری بجا رہا تھا'۔

رسالہ کیسا لگا؟ رائے دینا نہ بھولیں۔

عزیر اسرائیل
(مدیر اعلیٰ)

قلم کاروں سے گزارش

'اردو ریسرچ جرنل' ایک اعلیٰ تحقیقی جرنل ہے جس کا مقصد اردو میں تحقیق وتنقید کو فروغ دینا ہے۔اس وجہ سے 'اردو ریسرچ جرنل' کے لئے نگارشات بھیجنے والے معزز قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھیں:

☆ مضمون نگار اپنا نام،عہدہ، پتہ،موبائل نمبر اور ای میل مضمون کے شروع یا آخر میں ضرور لکھیں۔

☆ غیر شائع شدہ مضامین ہی ارسال کریں اور مضمون کے غیر مطبوعہ ہونے کی تحریری تصدیق بھی فرمادیں۔

☆ 'اردو ریسرچ جرنل' میں ریسرچ اسکالر کے مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں، ریسرچ اسکالر سے گزارش ہے کہ مضمون ارسال کرنے سے پہلے ایک بار اپنے اساتذہ کو ضرور دکھالیں۔

☆ مضمون نگار حوالوں کی صحت کا خاص خیال رکھیں، بلا حوالہ کوئی بات نہ درج کریں۔

☆ جرنل کے لئے مضمون ارسال کرنے کے بعد اگر مضمون نگار کہیں اور شائع کرانا چاہیں تو اس کی اطلاع 'اردو ریسرچ جرنل' کو دیں۔

☆ 'اردو ریسرچ جرنل' میں وہی مضامین شائع کئے جائیں گے جو تبصرہ نگاروں (Reviewers) کے ذریعہ قابل اشاعت قرار دئے جائیں گے۔

☆ **مضمون بھیجنے کے دو مہینہ کے اندر ہی مضمون کے اشاعت کی منظوری کا خط بذریعہ ای میل ایک کاپی رائٹ فارم کے ساتھ قلمکار کو ارسال کردیا جاتا ہے۔مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ کاپی رائٹ فارم کو پُر کرکے جرنل کو واپس بھیج دیں۔**

☆ بعض مضامین کو تبصرہ نگاروں کے نوٹ کے ساتھ اصلاح کے لیے واپس بھی کیا جاسکتا ہے۔ایسی صورت میں مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ اس کی اصلاح کرکے جلد واپس کردیں۔

☆ 'اردو ریسرچ جرنل' ایک ادبی اور علمی جرنل ہے۔اس میں ایسے مضامین کی اشاعت نہیں کی جائے گی جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنے۔

☆ تبصرہ کے لئے کم از کم دو کتابیں بھیجیں۔

☆ **مضمون ان پیج یا ورڈ کی فائل میں ٹائپ شدہ ہونا چاہئے۔پی ڈی ایف فائل یا ہارڈ کاپی قبول نہیں کی جائے گی۔**

☆ املا کمیٹی کی سفارشات کا خاص طور خیال رکھیں۔

نگارشات اس پتہ پر بھیجیں:

Add. Uzair Israeel, B-4, 4th Floor, Joga Bai, Near Rahmani Masjid, Opp. IslamicFlqh Academy, Jamia Nagar, New Delhi-110025

E-mail:editor@urdulinks.com

urjmagazine@gmail.com

www.urduLinks.com/urj

Contant: 9210919540

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی
اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

اقبال اور تصوف۔ تطبیق کا مسئلہ

Abstract

Iqbal and Tasawuf is much debated issue. Many writers have written on this topic. The major point of discussion in these writings has been the affiliation of Iqbal with Tasawuf. There has been a long debate on the issue that whether Iqbal was in favour of Tasawuf or against it. However, it is a fact that the thought and poetry of Iqbal can not be interpreted leaving Tasawuf aside. Iqbal has adopted the destination and objective of Taswuf but criticized its methodology. Resolution of this conflict is the major question which needs further research.

اقبال اور تصوف ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت لکھا گیا ہے۔اس موضوع پر بات کرنے والوں میں دونوں طرح کے موقف کے حاملین شامل ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ اقبال کا تصوف سے تعلق ہی نہیں ہے بلکہ اقبال نے تو تصوف کو اسلام کی سرزمین پر ایک اجنبی پودا قرار دیا ہے(۱)، حالانکہ یہ بات ایک مغالطے پر مبنی ہے، علامہ نے ایسا کبھی نہیں کہا،(۲) اور یہ کہ علامہ نے تصوف کو ہی ان تین بنیادی عوامل میں سے ایک قرار دیا جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے زوال کا باعث بنے: یہ عوامل ملوکیت، ملائیت اور تصوف ہیں۔(۳) بال جبریل میں علامہ نے فرمایا:

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی(۴)

لیکن اس کے ساتھ ایک موقف یہ بھی ہے کہ اقبال کا نہ صرف تصوف سے تعلق ہے بلکہ اقبال خود بھی ایک صاحب حال صوفی ہیں اور اس کے لیے بھی ہمارے پاس اقبال کی زندگی، اقبال کے علمی آثار اور شاعری میں بیسیوں شواہد موجود ہیں۔

جب تصوف کی بات ہوتی ہے تو ہمارے سامنے تصوف کی تین جہات آتی ہیں۔تصوف کا ایک پہلو تعمیر اخلاق ہے یعنی تصوف کا مقصود انسانی شخصیت میں اخلاقی اوصاف ومحاسن پیدا کرنا ہے جیسا کہ تصوف کی امہات الکتب اور صوفیہ کی تعلیمات سے ظاہر ہے۔ دوسری جہت میں تصوف ماورائے حواس حقائق کے مشاہدے کا وہ منہج ہے جس کے ذریعے وہ دینی حقائق جو عام آدمی کے لیے صرف معلومات کی حیثیت رکھتے ہیں صوفی کے لیے مشاہدہ بن جاتے ہیں۔ یہ وہی جہت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا روم فرماتے ہیں کہ عالم اور دانش ور آثار قلم پر سفر کرتا ہے جبکہ صوفی اور صاحب حال آثار قدم سے رہنمائی لے کر سفر کرتا ہے۔تصوف کی تیسری جہت وہ ہے جہاں یہ ایک نظام فکر اور تعبیر کائنات کے ایک اصول کے طور پر سامنے آتا ہے۔اقبال کے ہاں تصوف کی نوعیت کیا ہے اور اقبال تصوف کے کس پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور کس پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں یہ بات بڑی قابل غور ہے۔

کیا اقبال کا تصوف سے تعلق ہے؟ یہ ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا کسی بھی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں علامہ فرماتے ہیں کہ میرا تعلق سلسلہ قادریہ سے ہے اور میں شیخ عبد القادر جیلانی کے سلسلہ میں بیعت ہوں۔(۵) گویا یہ اقبال کی اپنی تحریر ہے جو ہمیں تصوف سے اقبال کی وابستگی کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔اقبال نے اپنے افکار کے ابلاغ کے لیے بھی تصوف کو ایک وسیلہ اور ذریعہ بنایا۔ تصوف کی اکثر لفظیات ہمیں اقبال کے کلام اور شاعری میں نظر آتی ہے۔ بال جبریل ہی کو لیں اس کا پہلا شعر ہی توضیح کے لیے ہمیں تصوف کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں(۶)

اقبال کے کئی اشعار ایسے ہیں جن کی توضیح وتشریح کے لیے ہمیں تصوف کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور پھر اقبال نے اپنی بنیادی اقدار اور آئیڈیلز کو بھی تصوف سے اخذ کیا اور ہمارے سامنے رکھا ہے جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں:

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب(۷)

اقبال تصوف کو دین کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں:

پس طریقت چیست اے والا صفات
شریعت را دیدن در اعماق حیات(۸)

صوفیہ سے اقبال کا تعلق اقبال کی زندگی کے کئی واقعات سے ہمارے سامنے آتا ہے۔حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری،مولانا روم کی رہنمائی میں روحانی سفر جو جاوید نامہ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے صوفیہ کے ساتھ اقبال کے تعلق کو بیان کرتا ہے۔اس لیے علامہ اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں:

شنیدم آں چہ ز پاکان امت
ترا بہ انداز رندانہ گفتم(۹)

تصوف کے باب میں اقبال کا امتیازی حوالہ یہ ہے کہ اقبال نے تصوف کو دینی حقائق سے آگہی اور شناسائی کا ایک وسیلہ قرار دیا ہے۔خطبات اقبال اقبال کی فکر کی بنیادی تصنیف ہے۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam میں اقبال کے فلسفیانہ افکار ہمیں ایک ایسی منظّم صورت میں ملتے ہیں جو فرد کی انفرادی اور قوم کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔یہاں اقبال نے دو خطبات کا موضوع ہی مذہبی تجربہ یا اس کے متعلقات کو بنایا ہے۔مذہبی تجربہ یا Religious Experience تصوف کے بغیر ایک امر محال ہے۔(۱۰)

خطبات کے دیباچے میں علامہ فرماتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ تصوف کے صحیح مکاتب نے اسلام میں مذہبی تجربے کے ارتقاء کی سمت کو درست کرنے اور اس کی صورت گری کے سلسلے میں نمایاں کام کیا ہے،مگر ان مکاتب کے بعد کے دور کے نمائندے جدید ذہن سے لاعلم ہونے کی بنا پر اس قابل نہیں رہے کہ نئے فکر اور تجربے سے کسی قسم کی تازہ تخلیقی تحریک پا سکیں۔وہ انہی طریقوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو ان لوگوں کے لئے وضع کئے گئے تھے جن کا ثقافتی نقطہ نظر کئی لحاظ سے ہمارے نقطہ نظر سے مختلف تھا۔قرآن کہتا ہے کہ ''تمہاری تخلیق اور قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جانا ایک نفس واحد کی تخلیق و بعثت کی طرح ہے''۔حیاتیاتی وحدت کا زندہ تجربہ جو اس آیت میں بیان ہوا ہے آج ایسے منہاج کا تقاضا کرتا ہے جو موجودہ دور کے ٹھوس ذہن کے لیے عضویاتی طور پر کم شدت رکھتا ہو مگر نفسیاتی لحاظ سے زیادہ موزوں ہو۔(۱۱)

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس تصوف کی علامہ بات کر رہے ہیں اور جو آج کے ذہن کے لیے اور آج کے دور کے لیے مذہبی تجربے کو یقینی بنائے اس کی صورت کیا ہو؟ یہاں ہمیں ایک ایسے التباس اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے گزرے بغیر ہم اس عقدے کو حل نہیں کر سکتے۔ اقبال کی فکر تصور خودی پر استوار ہے۔وہ اپنے آپ کو سر الوصال کی بجائے سر الفراق کہتے ہیں جیسا کہ خواجہ حسن نظامی کے نام علامہ کی تحریروں میں یہ بات آئی ہے اور دوسری طرف اقبال صوفیانہ تصورات اور تصوف کے بنیادی اور کلیدی اصولوں کی تفہیم کے لیے صوفیہ کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔

علامہ اکابر صوفیہ سے ہی متاثر ہو کر مرد کامل کا تصور اخذ کرتے ہیں۔سید عبدالواحد معینی نے ''مقالاتِ اقبال'' میں ایک دلچسپ مکالمہ کے عنوان سے محمد دین فوق سے علامہ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔اس میں علامہ فرماتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالی نے خاص دل و دماغ عطا کیا ہے اور تزکیہ نفس میں صاحب کمال ہیں تیر از کمان رفتہ اور آب از جو رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔(۱۲)

اقبال کے علمی آثار میں تصوف کے بارے میں بیسیوں بکھرے ہوئے نکات اور حقائق کے ساتھ ساتھ ایک منظّم اور مربوط تحریر گلشن راز جدید ہے جو ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتی ہے کہ اقبال تصوف کے بنیادی اصول اور تصورات کی تفہیم کے لیے اکابر صوفیہ کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

علامہ کی تصنیف گلشن راز جدید سے پہلے گلشن راز کا تذکرہ ضروری ہے جو محمود شبستری نے لکھی اور اس طرح لکھی کہ ایک مرتبہ جب وہ اپنے شیخ سے ملنے کے لیے آئے تو ان کے شیخ کے پاس کوئی سائل بیٹھا تھا جو کچھ سوالات لے کر آیا تھا۔ان کے شیخ نے سائل کو جوابات کے لیے محمود شبستری کے سپرد کیا۔محمود شبستری اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں سائل سے سوالات سنتے گئے اور اسی وقت ان سوالات کے جوابات لکھواتے گئے اور یہ جوابات شعری شکل میں تھے۔سائل کے کیے گئے پندرہ سوالات کے جوابات جب مکمل ہوئے تو یہ گلشن راز کی صورت میں ایک کتاب کی شکل میں ڈھل چکے تھے۔ انہی پندرہ سوالات میں سے علامہ نے گیارہ سوالات کو اٹھایا اور ان کا بہ اندازِ جدید جواب دیتے ہوئے گلشن راز جدید تصنیف کی جس میں علامہ نے

کئی حوالوں سے ان سوالات کے جوابات گلشن راز سے مختلف انداز میں دیئے۔ یہاں صرف ایک سوال کے جواب میں سے کچھ اشعار بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ گلشن راز کا بارہواں اور گلشن راز جدید کا چوتھا سوال ہے۔سوال یہ ہے:

قدیم و محدث از ہم چوں جدا شد
کہ ایں عالم شد آں دیگر خدا شد(۱۳)

قدیم اور محدث ایک دوسرے سے کیسے جدا ہوئے، کہ محدث جہان بن گیا اور قدیم خدا رہا۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے محمود شبستری فرماتے ہیں:

قدیم و محدث از ہم جدا نیست
کہ از ہستی است، باقی دائما نیست
ہم آں است و ایں مانند عنقا است
جز از حق جملہ اسمے بے مسما است
عدم موجود گردد ایں محال است
وجود از روی ہستی لا یزال است
جہاں خود جملہ امر اعتباری است
چو آں نقطہ کاندر دور ساری است
یکی گر در شمار آید بہ ناچار
نگردد واحد از اعداد بسیار
حدیث ما سوی اللہ رہا کن
بہ عقل خویش ایں را زآں جدا کن
چو شک داری در آں کایں چوں خیال است
چو با وحدت دویی عین ضلال است
عدم مانند ہستی بود یکتا
ہمہ کثرت ز نسبت گشت پیدا
وجود ہر یکے چوں بود واحد
بہ وحدانیت حق گشت شاہد(۱۴)

قدیم اور محدث ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ کہ یہ تو ہستی سے ہی موجود ہیں اس کے علاوہ اسے بقا نہیں ہے۔

سب کچھ وہی ہے۔اور یہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔حق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے صرف نام ہی نام ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

عدم کا باوجود ہو جانا ایک امر محال ہے۔ بروئے ہستی وجود کو زوال نہیں۔

یہ تمام جہاں محض ایک اعتباری وجود ہے۔اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک نقطہ حرکت کے باعث ایک دائرہ نظر آتا ہے۔

اگر ایک کسی وجہ سے شمار میں آنے لگے تو بہت اعداد کے باعث وحدت کثرت میں نہیں بدلتی۔

'ماسوی اللہ باطل' کی حدیث کے مفہوم کو سمجھ اور اپنی فہم میں اسے اس سے الگ اور ممتاز جان۔

اگر تجھے اس میں کچھ شک در آئے کہ یہ صرف خیال ہے تو جان لے کہ وحدت کے ساتھ دوئی کا تصور کھلی گمراہی ہے۔

ہستی کی طرح عدم بے مثال ہے کثرت کا یہ سارا منظر صرف نسبت کے باعث پیدا ہوا ہے۔

چونکہ وجود صرف وجود واحد ہے، وحدانیت پر تو خود حق گواہ ہے۔

علامہ گلشن راز جدید میں اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

خودی را زندگی ایجاد غیر است
فراق عارف و معروف خیر است
از و خود را بریدن فطرت ما است
تپیدن نارسیدن فطرت ما ست
نہ مارا در فراق او عیارے
نہ او را بے وصال ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او! چہ حال است
فراق ما فراق اندر وصال است
جدائی خاک را بخشد نگاہے
دہد سرمایہ کوہے بہ کاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را سازگار است
من و او چیست؟ اسرار الٰہی است
من و او بر دوام ما گواہی است
بخلوت ہم بجلوت نور ذات است
میان انجمن بودن حیات است
گہے از سنگ تصویرش تراشیم
گہے نادیدہ بر وے سجدہ پاشیم
چہ سودا در سر ایں مشت خاک است
ازیں سودا درونش تابناک است
خودی را تنگ در آغوش کردن
فنا را با بقا ہم دوش کردن
بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست

اگر او را تو در گیری فنا نیست
خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است(۱۵)

تخلیق،خودی کی زندگی کا تقاضا ہے، عارف ومعروف کا فرق خیر کا بعث ہے۔

اپنے آپ کواللہ تعالی سے جدا رکھنا، تڑپنا اور (مقصود تک) نہ پہنچنا ہماری فطرت ہے۔

نہ اس کے فراق سے ہماری قدر و قیمت (کم ہوتی)، نہ اسے ہمارے وصل کے بغیر قرار ہے۔

نہ وہ ہمارے بغیر، نہ ہم اس کے بغیر۔ یہ کیا صورت حال ہے؛ ہمار فراق، فراق اندر وصال ہے۔

جدائی آدم خاکی کو نگاہ عطا کرتی ہے، یہ تنکے کو پہاڑ کی سطوت عطا کرتی ہے۔

جدائی عشق پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، جدائی عاشقوں کو راس آتی ہے۔

''میں'' اور ''وہ'' کیا ہیں؛ اللہ تعالی کے اسرار ہیں، میرا اور اس کا الگ الگ وجود ہمارے دوام کا ثبوت ہے۔

خلوت اور جلوت دونوں جگہ ذات باری تعالی کا نور ہے، انجمن میں ہونا ہی زندگی ہے۔

کبھی ہم پتھر سے اس کی تصویر تراشتے ہیں اور کبھی اسے دیکھے بغیر سجدے کرتے ہیں۔

مشت خاک کے سر میں یہ کیا سودا سمایا ہے؟ اسی سودا سے تو اس کا اندرون روشن ہے۔

خودی کو پوری طرح اپنا لینا، گویا فنا اور بقا کو اکٹھا کر دینا ہے۔

اللہ تعالی کے بحر میں گم ہو جانا ہمارا انجام نہیں ہے، اگر تو اسے اپنا لے، تو پھر تیرے لیے فنا نہیں۔

خودی کا خودی میں سما جانا محال ہے، خودی کا اپنا آپ بننا ہی اس کا کمال ہے۔

ان دونوں جوابات کے مفہوم میں فرق اور تفاوت عیاں ہے۔ یہاں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ کی فکر کا بنیادی نکتہ تصورِ خودی ہے۔ خودی کی تعمیر، دریا میں رہتے ہوئے بطور گوہر اپنی انفرادیت کو باقی رکھنا اور اس انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے ارتقا کی منزلوں کو طے کرنا اس تصور کا ایک بنیادی خاصہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف اگر ہم صوفیہ کی تعلیمات اور خود گلشن راز کی تعلیمات کو دیکھیں تو ان سے مراد اپنی ہستی کو من حیث الکل ہستیِ مطلق میں فنا کرنا ہے اور فنا کا یہ عمل ایک ایسا مکمل اور مسلسل عمل ہے کہ اس کے نتیجے میں حق کی ہستی کے مقابل سالک کی ہستی کوئی وجود نہیں رکھتی۔ جیسا کہ عطار نے کہا:

تو مباش اصلاً کمال ایں است و بس
تو ز تو گم شو وصال ایں است و بس(۱۶)

اصل کمال یہ ہے کہ تو باقی نہ رہے اور تو اپنے آپ سے گم ہو جا کہ وصال یہی ہے۔

اقبال اور تصوف پر لکھنے والے اکثر مصنفین نے بھی اس الجھن کے حل کو مرکز توجہ نہیں بنایا۔ ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کی کتاب ''اسلامی تصوف اور اقبال'' اس موضوع پر بنیادی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے 'علامہ اقبال اور مسلک تصوف' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے(۱۷) اس باب میں انہوں نے اقبال کے مسلک تصوف سے متعلق مختلف نکات مثلاً مولانا روم سے اقبال کا تعلق اور عقیدت (۱۸) اقبال کے نزدیک مرشد سے تعلق اور وابستگی کی اہمیت (۱۹) اقبال کے سلسلۂ قادریہ سے تعلق (۲۰) اور اقبال کی اپنے فرزند آفتاب اقبال کو کسی سلسلہ طریقیت میں مرید کروانے کی خواہش کا ذکر کیا ہے۔(۲۱) مگر اس مسئلے کے حل کا کوئی تذکرہ نہیں جو اس تحریر میں ہمارا موضوع ہے۔

اسی موضوع پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایک کتاب ''اقبال اور مسلک تصوف'' کے عنوان سے لکھی۔ انہوں نے بھی اس کتاب میں 'اقبال اور مسلک تصوف' کے عنوان سے ایک باب شامل کیا۔ اس باب میں اقبال کے تصوف سے متعلق مختلف افکار اور متعلقات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً مولانا روم سے اقبال کا تعلق (۲۲) عقل وعشق کا موازنہ (۲۳) تصور فقر (۲۴) اور قرب الٰہی (۲۵) وغیرہ۔ جب مولانا روم سے اقبال کے تعلق کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ اقبال نے روم سے یہ نکات اخذ کیے:

انسان یعنی مرد کامل یا مرد مومن کی تلاش،
سست عناصر ہمراہیوں سے بیزاری،
جلال و جمال - یعنی طاقت و رعنائی کے مثالی کرداروں کی آرزو اور سعی مسلسل (۲۶)۔

پورے باب میں جہاں دیگر تفصیلات موجود ہیں اس الجھن کا کوئی حل نہیں ملتا کہ اکابر صوفیاء کے طرز فکر اور علامہ کے نقطہ نظر میں تفاوت کا حل کیا ہے۔ تاہم علامہ کے ملفوظات کے حوالے سے ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان کردہ علامہ کا یہ بیان اس باب میں نظر آتا ہے۔

انا الحق کے معنی یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ انا ہی اصل چیز

ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہوگیا تو اس نے اپنی ہستی مٹادی۔(۲۷)

یہ بیان اس تفاوت اور بعد کو نمایاں کر رہا ہے۔ جو اکابر صوفیا اور علامہ کی فکر میں ہے۔ 'اقبال اور تصوف' کے عنوان سے ہی ایک وقیع کتاب پروفیسر آل احمد سرور کی ہے۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس موضوع پر اس کتاب میں نامور اہل علم اور اقبال شناسوں کی تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان میں یہ اہل علم شامل ہیں:

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر پی این پشپ، کمال احمد صدیقی، جگن ناتھ آزاد، مفتی جلال الدین، ڈاکٹر حامد کاشمیری، قاضی غلام محمد، ڈاکٹر عالم خوندمیری، محمد یوسف ٹینگ، میکش اکبر آبادی، ڈاکٹر فصیح احمد کمالی۔(۲۸)

تاہم یہ کتاب بھی ہمیں درپیش مسئلے کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتی۔

چونکہ ہم نے بطور مثال محمود شبستری کی گلشن راز اور گلشن راز جدید سے ایک مثال دی ہے۔ دونوں کے فکری بعد کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد بقائی ماکان لکھتے ہیں:

> شبستری کا مقصود یہ ہے کہ: عارف واقعی کسی است کہ ہمہ ہستی و وجود خود در برابر خدا در باز دو بہ این ترتیب خود را پاک گرداند۔ در ایں صورت فقط اوی تواند بہ سر وحدت واقف شود و تنہا اوست کہ بہ وحدت باو پروردگار نائل می آید و حقیقت وحدت وجود را درمی باید
> چوں ذاتت پاک گردد از ھم شین
> نمازت گرد و آنگہ قرۃ العین
> نماند درمیانہ ہیچ تمیز
> شود معروف و عارف جملہ یک چیز
> از دیدگاہ اقبال عرفان راستین آن است کہ ایں جہان را گذران و در معرض فنا و زوال می بیند:
> جہان یکسر مقام آفلین است
> دریں غربت سرا عرفان ہمیں است
> ولی درمیان این پدیدہ کلی مرگ، فقط ''من'' بشری است کہ از تلاشی و فنا مبرا و فراتر از آن است .....
> 'من' در مرحلہ نہائی در وجود مطلق محو و زائل نمی شود بلکہ از او باقی می ماند و فردیت خود را نگاہ می دارد''(۲۹)

یعنی علامہ تشکیل کردار اور تعمیر ذات کی اسی منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں جس کی طرف صوفیہ نے رہنمائی کی مگر اس کے لیے وہ طریق اختیار نہیں کرتے جو اکابر صوفیہ کا طریق ہے۔ اگر اکابر صوفیہ کی تعلیمات کو دیکھیں تو ان آج بھی سے وہ رہنمائی میسر آتی ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آج کے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تصوف کا وہ منہج وضع کر سکتے ہیں جس کی ضرورت اقبال نے خطبات کے دیباچے میں بیان کی ہے۔ اکابر صوفیہ کا یہ قول اس سے بہت متعلق ہے۔

اللھم کمل اوقاتی وتمم اناتی بحیث تخالصه عن تشویشات خطراتی ووساوس خناسی(۳۰)

> اے اللہ میرے اوقات کو کامل اور میرے انات کو اتمام یافتہ فرما دے اس طرح کہ میرے احوال کی تشویش اور میرے خناس کے وساوس کو اپنے لیے خالص کر دے۔

یہاں اگر ہم اس قول کا تجزیہ کریں تو انسانی فکر اور ارتقا کا وہ راستہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کو طے کرنے کے لیے آج کے علوم خصوصاً نفسیات، جینٹکس اور جدید فزکس بڑی حد تک (ہماری) معاونت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس منہج کو اختیار کرتے ہوئے ہم اس تصوف کا وہ طریق وضع کر سکتے ہیں جو آج کے ذہن کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہو، دینی حقائق کو ایک حقیقت کے طور پر بھی ہمارے سامنے لاتا ہو، غیر محسوس حقیقتوں کو ہماری زندگی کے محسوس حقائق بھی بناتا ہو اور اس مذہبی تجربے کی طرف بھی ہمیں رہنمائی کرتا ہو جس کا تذکرہ ہمیں اقبال کے پہلے دو خطبات میں ملتا ہے لیکن اس تک پہنچنے کا راستہ اقبال ہی کا ایک قول ہے۔ علامہ نے Reconstruction کے دیباچے ہی میں کہا کہ جوں جوں علم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے نئے اُفق کھلتے چلے جاتے ہیں اس امر کا امکان ہے کہ شاید کتنے ہی دوسرے نظریات، ان خطبات میں پیش کئے گئے خیالات سے بھی زیادہ محکم ہوں جو آئندہ ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم فکر انسانی کے ارتقا پر بڑی احتیاط سے نگاہ رکھیں اور اس کی جانب ایک بے لاگ تنقیدی رویہ اپنائے رکھیں۔(۳۱)

ہمارے سامنے اقبال کی تمنا بھی ہے، آرزو بھی ہے، اقبال کا دیا ہوا معیار بھی ہے اور وہ امکان بھی کہ جس کے ذریعے سے ہم اقبال کی آرزو کو تصوف کا جدید منہج وضع کرتے ہوئے پورا کر سکتے ہیں۔ وہ منہج جو اقبال کی آرزو کو پورا کرنے کا باعث بھی ہو، آج کے دور کے سوالات کا جواب بھی ہو اور ہماری زندگی میں اکابر صوفیہ کی تعلیمات کی تاثیر بھی پیدا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دین کے بنیادی تصورات اور معتقدات پر ہمارا ایسا یقین پیدا کر دے کہ حقائق محسوس اور حقائقِ غیر محسوس دونوں ہماری زندگی میں یکساں حیثیت کی حقیقتیں بن جائیں، جیسا کہ علامہ بانگ درا میں فرماتے ہیں:

تعلیمِ پیرِ فلسفہ مغربی ہے یہ

ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام، وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
''باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہ ای بے جنوں مباش''(۳۲)

مگر اس منزل کے حصول کے لیے پہلے اکابر صوفیہ اور علامہ کے طریق میں تطبیق کے امکانات کو تلاش کرنا ہوگا کہ ان میں موجود تفاوت رفع ہو سکے۔اس تفاوت کو رفع کیے بغیر مردِ کامل کی تشکیل کی وہ منزل کس طرح مل سکتی ہے جو حاصل تو طریق صوفیہ کا ہے مگر اس کے لیے جو راستہ اختیار کیا جا رہا ہے وہ اکابر صوفیہ کے طریق سے مختلف ہے۔

حوالہ جات

۱- غلام احمد پرویز، تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵، بی گلبرگ ۲، لاہور، اگست ۲۰۰ء، ص ۳۲۲۔
۲- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۱۱۲۔
3- Latif A. Sherwani, Speeches, Writings and Statements of Iqbal, Iqbal Academy Pakistan, 2009, p. 231-232.
۴- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۶۶۔
۵- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، ص ۱۱۲۔
۶- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۴۵۔
۷- ایضاً، ص ۴۴۱۔
۸- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء، ص ۸۲۷۔
۹- ایضاً، ص ۹۸۶۔
10- Allama Muhammad Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Institute of Islamic Culture, 2009, p. 2-3, 105.
11- Ibid, p. xxi-xxii.
۱۲- سید عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۰۔
۱۳- شیخ محمود شبستری، گلشن راز، مرکز تحقیقات فارسی پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۹۲؛ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۵۴۹۔
۱۴- شیخ محمود شبستری، گلشن راز، ص ۹۲-۹۳۔
۱۵- علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۵۴۹۔
۱۶- فرید الدین عطار، منطق الطیر، مرکز نشر دانشگاہے، ایران، ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۔
۱۷- ڈاکٹر ابو سعید نور الدین، اسلامی تصوف اور اقبال' اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۵۹ء ص ۲۲۹
۱۸- ایضاً، ص ۲۳۱
۱۹- ایضاً، ص ۲۳۷
۲۰- ایضاً، ص ۲۳۰
۲۱- ایضاً، ص ۲۳۸
۲۲- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اقبال اور تصوف، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۱۹۷
۲۳- ایضاً، ص ۲۳۰
۲۴- ایضاً، ص ۲۳۸
۲۵- ایضاً، ص ۲۷۹
۲۶- ایضاً، ص ۱۹۷
۲۷- ایضاً، ص ۳۴۰
۲۸- آل احمد سرور، اقبال اور تصوف، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، ۱۹۸۰ء
۲۹- محمد بقائی ماکان، تصوف در تصور اقبال-شبستری و کسروی، انتشارات فردوس، خیابان دانشگاہ، کوچہ متیرا، تہران، ۱۳۸۰، ص ۱۰۲-۱۰۳
۳۰- محمد عبد الرحمٰن چھوہروی، مجموعہ صلوات الرسولؐ، جزو ۲۳، دار العلوم اسلامیہ رحمانیہ، ہری پور، ص ۲۹۔
31- Allama M. Iqbal, Recostruction of Religious Thought in Islam, p.xxii.
۳۲- علامہ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۷۵۔

Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
Vol.:II, Issue:I Jan.-March 2015

پروفیسر ابن کنول

صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو مرثیہ میں رزم نگاری

Urdu Marsiyah mein Razm Nigari by Prof. Ibne Kanwal, Head, Department of Urdu, Delhi University, Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 10-14.

اردو کی ابتدائی اور ارتقائی صدیوں میں جن اصناف کو نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے اُن میں مرثیہ بھی شامل ہے۔ دکنی شاعری میں جس طرح مثنوی مقبول رہی مرثیہ کو بھی شعرا نے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یوں مرثیہ ہر وہ نظم ہے جس میں کسی کو بعد وفات یاد کیا جائے، لیکن کثرت سے واقعۂ کربلا کو نظم کرنے کی وجہ سے مرثیہ سے مراد عام طور پر وہی منظوم کلام ہوتا ہے جس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے سانحہ کو بیان کیا گیا ہو۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ امام حسینؓ میدانِ جنگ میں یزیدی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ میدانِ جنگ کے انہی چند روزہ واقعات کو تمام مرثیہ نگاروں نے نظم کیا ہے۔ مرثیوں میں حضرتؓ کی مکی اور مدنی زندگی کے واقعات کہیں نظر نہیں آتے۔ ظاہر ہے جب موضوع جنگ کا ہوگا تو بیان میں گھوڑوں کے دوڑنے، تلواروں کے چمکنے، نیزوں کے چلنے، تیروں کے لہرانے، زخمیوں کے گرنے اور لہو کے اُچھلنے کے مناظر ہی شامل ہوں گے، باقی تمام موضوعات صرف واقعات کو پھیلانے میں معاونت کریں گے۔

مرثیوں کا مطالعہ ہم مختلف جہتوں سے کر سکتے ہیں۔ ان میں انسانی رشتوں سے وابستہ جذبات کا اظہار بھی ہے، تہذیب کی مرقع نگاری بھی ہے اور فطرت کے مناظر بھی ہیں، لیکن مرکزی موضوع رزم کا بیان ہے۔ مرثیہ نگاروں نے رزمیہ کو جس مقام تک پہنچایا اس کی دوسری مثال اردو میں داستان امیر حمزہ یا بوستان خیال کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ اردو میں رزمیہ کی مثال صرف مرثیوں اور داستانوں ہی میں نظر آتی ہے، لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ داستان میں متعدد بادشاہوں اور شاہزادوں کے لشکروں کے مابین جنگیں ہوئی ہیں، لیکن مرثیے میں ایک خاندان کے چند افراد ہزار ہا سپاہیوں پر مشتمل لشکر سے برسر پیکار ہیں۔ داستانوں کی لڑائیاں مہینوں اور برسوں تک جاری رہتی ہیں لیکن مرثیہ کی جنگ صرف ایک دن کی جنگ ہے، اس کے باوجود مرثیہ نگاروں کی قوتِ بیان نے اس مختصر جنگ کو شاہنامہ کے بیانِ رزم کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ مرثیوں کی رزم نگاری کسی طرح ایلیڈ، اوڈیسی، رامائن یا مہابھارت سے کمتر نظر نہیں آتی۔

دراصل رزمیہ یا ایپک (Epic) میں خیر و شر کی جنگ کو پیش کیا جاتا ہے، اس میں اچھے اور برے کردار صف آرا ہوتے ہیں، اچھے کرداروں کی فتح ہوتی ہے۔ کربلا کی جنگ دنیا کی واحد جنگ ہے جہاں امام حسین ہار کر بھی فاتح کہلائے اور یزیدی فوج کو جیت کر بھی ذلت ملی۔ مرثیوں میں واقعات کا بیان حضرت امام حسینؓ کی مدینہ سے روانگی سے شروع ہوتا ہے۔ اس سفر میں راستے کی دشواریاں بھی رزم ہی کا حصہ ہیں۔ پھر جب میدانِ کربلا میں یزیدی فوجیں انھیں پیش قدمی سے روک لیتی ہیں اور امام حسینؓ وہیں خیمہ زن ہوتے ہیں، فرات قریب ہونے کے باوجود انھیں پانی تک نہیں ملتا، عجیب بے بسی اور بے کسی کا عالم ہے۔ جنگ سے قبل ان واقعات کو بیان کر کے مرثیہ نگاروں نے جو فضا سازی کی ہے وہ جنگ کے بیان کو اور زیادہ دردناک بنا دیتے ہیں۔ رزمیہ میں صرف فوجوں کا مقابل آنا، حملہ کرنا، تلواریں چلانا، گھوڑوں کا دوڑنا ہی شامل نہیں بلکہ اطراف کا ماحول، خیموں کی آراستگی، میدان جنگ کا موسم، گرمی کی شدت، رات کی ہولناکی غرضیکہ سپاہیوں کے احساسات و جذبات کا بیان بھی رزمیہ کا حصہ ہے۔ دراصل مرثیہ نگار اپنے بیان سے ایک ایسی فضا تشکیل کرتے ہیں جو سامعین کو میدانِ

جنگ کا حصہ بنادیتی ہے۔شاہنامہ کی روایت کو لے کر چلتے چلتے اردو کے مرثیہ نگار اُس سے آگے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یوں مرنے والے کے اوصاف حمیدہ کو بیان کرنے والی بیانیہ نظم مرثیہ کہلاتی ہے،لیکن اردو مرثیہ میں واقعات کربلا کی شمولیت کے بعد اس کی نہ صرف ہیئت میں تبدیلی آئی بلکہ اجزائے ترکیبی بھی متعین ہوگئے،یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، ماجرا، جنگ، شہادت اور بین، مذکورہ اجزا ہی اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ مرثیہ میں رزمیہ ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ اجزا میدانِ جنگ کا منظر بیان کرتے ہیں۔ چہرہ تمہید ہے جس میں جنگ سے قبل کی منظر کشی کی جاتی ہے۔سراپا میں شہید کی شکل وشباہت اور شوکت ووجاہت کا بیان ہوتا ہے، جنگ کے لیے جاتے وقت کی وداعی کو ''رخصت'' کہا گیا ہے۔میدانِ جنگ میں رعب وجلال کے ساتھ آنے کو ''آمد'' کا نام دیا گیا اور اپنے حسب ونسب، بزرگوں کے کارناموں کے بیان کو ''رجز''۔جنگ پر آنے والے کارناموں کے بیان کو ''ماجرا'' کہا گیا، پھر ''جنگ'' شروع ہوتی ہے اور آخر میں ''شہادت'' کے بعد خیموں میں ''بین'' کا منظر ہوتا ہے۔ان سب کا تعلق رزم سے ہے،اسی لئے مرثیہ کو رزمیہ نظم نگاری کا اعلیٰ نمونہ کہا جاتا ہے۔

مرثیوں میں داستانوں کی طرح مرکبان تیز رفتار کے دوڑنے، شمشیروں کے ٹکرانے اور نیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ابتدا تا اختتام موقع بہ موقع سنائی دیتی ہیں۔انیسویں صدی کے آخر تک کے مرثیہ نگار ان آلات حرب سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے جو میدان کربلا کی جنگ کے وقت استعمال ہوئے ہوں گے،اسی لئے گزشتہ صدیوں کے مرثیہ نگاروں کے بیانِ رزم میں مشاہدہ کی صداقت نظر آتی ہے۔ بیشتر مرثیہ نگار لڑائی سے قبل شہدا کی تلواروں اور گھوڑوں کی بھی تعریف کرتے ہیں:

بانکی وہ اس کی وضع کہ دشمن کے دل کو بھائی
بے ساختہ زباں سے یہ نکلے کہ ہائے ہائے
تحریر خوں کی دھار پہ دیکھے تو جان جائے
معشوق پان کھاکے کبھی جیسے مسکرائے
جوہر دکھا دیئے تو ستم برملا کیا
گویا پری نے خندۂ دنداں نما کیا

(سید محمد ہادی لکھنوی)

کچھ تھم کے یوں چلی وہ عدوکش قضا نظیر
سن سے نکل کے سخت کمانوں سے جیسے تیر
کھینچی چمک نے دور تک اک نور کی لکیر
جھنکار نے بلند کیا شور دار و گیر
اس چال پر نثار ہر اک حیلہ ساز تھا
اپنی ادا پہ خود بھی جفا جو کو ناز تھا
اللہ ری جاں نظارئ و انداز دلبری
ہر جا تھا غل کہ تیغ کے پیکر میں ہے پری
مشہور تھی زمانہ میں اس کی ستم گری
اس پر بھی خونِ ناحق انساں سے تھی بری
پہلے تو سن سے رو میں سوئے حلق جھک گئی
مانگی اماں جو اس سے تو خط دے کے رک گئی

(شاد عظیم آبادی)

زمانۂ قدیم میں جنگوں میں گھوڑے کو خاص اہمیت حاصل تھی،اسی لئے مرثیوں میں گھوڑوں کی بھی تعریفیں بیان کی گئی ہیں:

پری ہے یا کہ چھلاوا ہے یا کہ باد سحر
کہ پیچھے گھوڑے سے رہتی ہے کوسوں تھک کے نظر
پکارے رومی و شامی کہ آتا ہے یہ کدھر
اِدھر ہے یا کہ اُدھر ہے، اُدھر ہے یا کہ اِدھر
دمِ خرام بہ عقل بشر نمی آید
چو روحِ جسم لطیفش نظر نمی آید

(راجہ بلوان سنگھ وائی بنارس)

رزمیہ بیان میں مبالغہ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔مرثیوں کے علاوہ دیگر داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت بیان میں حیرت استعجاب کی فضا تیار کردیتی ہے۔جن، دیو اور طلسمی لڑائیاں بیان کو دلچسپ بنادیتی ہیں، لیکن مرثیوں کے رزمیہ بیان کا معاملہ مختلف ہے، یہاں بیان تاریخ کا حصہ ہے، سبھی کردار حقیقی ہیں اس لئے تخیل کی پرواز کو محدود رکھ کر الفاظ کی تپش سے بیان میں ایسا اثر پیدا کرنا ہوتا ہے کہ نہ صداقت کا دامن چھوٹے اور نہ شدت میں کمی آئے۔وہی مرثیہ نگار کامیاب نظر آتا ہے جس کے پاس الفاظ کا خزانہ ہے اور جو ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھنے کا ہنر جانتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک دن کی لڑائی کا بیان برسوں لڑی گئی جنگوں کے بیان سے زیادہ پُر اثر نظر آتا ہے۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا رزم کا بیان صرف جنگ تک محدود نہیں بلکہ دیگر لوازمات بھی ہیں۔مرثیہ نگاروں نے لڑائی سے قبل و بعد مختلف موضوعات کو مرثیہ کا حصہ بنایا ہے، یہاں ممکن نہیں کہ سب کو مثال کے لئے پیش کیا جائے۔چند ایسی مثالوں پر اکتفا کروں گا جن سے یہ ثابت ہو کہ مرثیہ ہی رزم نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

حضرت عباس کی آمد کو بیشتر مرثیہ نگاروں نے بڑے پُر جوش اور

پُرشکوہ الفاظ میں پیش کیا ہے۔

میر ضمیر کہتے ہیں:

غل ہے میدان میں کہ عباس علی آتے ہیں
اور شجاعانِ عرب رعب سے تھرّاتے ہیں
خوف آمد ہی میں بے جان ہوئے جاتے ہیں
طائر جان، قفس جسم میں گھبراتے ہیں
غل ہے اک شور ہے، طاقت نہیں گفتار کی ہے
آمد آمد پسر حیدر کرار کی ہے

مرزا دبیر لکھتے ہیں:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو
ہے شور فلک کا کہ یہ خورشید عرب ہے
انصاف یہ کہتا ہے کہ چپ، ترک ادب ہے
خورشید فلک، پرتو عارض کا لقب ہے
یہ قدرت رب، قدرت رب، قدرت رب ہے
ہر ایک کب اس کے شرف و جاہ کو سمجھے
اس بندے کو وہ سمجھے جو اللہ کو سمجھے

عرب کی جنگوں میں یہ طریقہ تھا کہ ابتدا میں جنگ مغلوبہ سے پہلے طرفین سے ایک ایک پہلوان لڑنے کے لئے نکل آتا تھا اور لڑائی سے قبل اپنا حسب نسب اور اپنی بہادری اور شجاعت کو بیان کرتا تھا۔ میر انیس قاسم کی رجز خوانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بڑھ کر رجز یہ پڑھنے لگے قاسم جری
عالم میں کون ہے جو کرے ہم سے ہمسری
ہم حیدری ہیں ہم میں ہے زور غضنفری
ہم سے ہے اوجِ پایۂ اورنگ صفدری
شہرہ ہے حرب و ضرب شہ خاص و عام کا
سکّہ ہے شش جہت میں ہمارے ہی نام کا

انیسویں صدی میں جو مرثیے لکھے گئے ان میں جنگ کے مناظر کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ سننے والوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ، آلاتِ حرب کا بیان، حریفین کے تیور، ایک دوسرے پر حملے، شمشیر زنی، نیزہ بازی، سروں کا اُچھلنا، ہاتھ پیروں کا کٹ کٹ کر گرنا، چیخ وپکار، غرضیکہ یہ تمام مناظر مرثیے سننے یا پڑھنے کے بعد فلم کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ انیسؔ ودبیرؔ کے علاوہ دیگر مرثیہ نگاروں کے بیانِ رزم میں بھی شدّت و حدّت دکھائی دیتی ہے۔ دراصل اردو مرثیوں اور داستانوں کا عہد سیاسی زوال کا عہد تھا، لوگ تلوار کے نہیں زبان کے غازی بن کر رہ گئے تھے۔ داستانوں میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی فتوحات اور مرثیوں میں اسلاف کے کارناموں کا بیان سن کر اپنی پیٹھ تھپتھپاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ مرثیوں میں رزمیہ بیانات کو سن کر اپنی برتری کا احساس ہوتا تھا۔

داستانوں کے مقابلہ میں مرثیے اس لیے مبالغہ کے باوجود مقبول ہوئے کہ اس کے واقعات تاریخ کا حصہ تھے اور اس میں عقیدت شامل ہے، اسی لئے مرثیوں کو سن کر یا پڑھ کر دل رو دیتا ہے اور زبان گنگ ہوجاتی ہے اور اس کے پیچھے مرثیہ نگاروں کے بیان کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ مرثیہ نگار کے اس طرح کے بیانات دل دہلا دینے اور جوش پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں:

یک بہ یک طبل بجا فوج کے گرجے بادل
کوہ تھرّائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا
شور میداں میں تھا کہ دلیرو نکلو
نیزہ بازی کرو، رہواروں کو پھیرو، نکلو
نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو، نکلو
نمازیو! صف سے بڑھو، غول سے شیرو، نکلو
رستمو دادِ وفا دو کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدر کرّار کی اولاد کا ہے (انیسؔ)
وہ گرد میں نیزوں کی سنانوں کا جھلکنا
وہ دھوپ میں تلواروں کے قبضوں کا چمکنا
بجلی کی طرح سے وہ کمانوں کا کڑکنا
اُڑنا وہ پھر بہروں کا نشانوں کا لچکنا
اونچے جو کئے بڑھ کے علم اہل جفا نے
در کھولے جہنم کے، پھر پہروں کی ہوا نے
(نقش لکھنوی)

جنگ کے بیان میں بھی مرثیہ نگار فنّی حسن کو ملحوظ رکھتے ہیں، استعارات و

تشبیہات سے بیان کو جاذبِ نظر بناتے ہیں:

تیغیں کھنچیں جو ابروؤں کی رن میں ناگہاں
بڑھ کر بلند کیں صف مژگاں نے برچھیاں
چلّہ بنی جو زلف تو ابرو بنے کماں
پلکوں کے لیس ہوگئے سب تیر و بے اماں
نیزہ لیا نگاہِ جلالت شعار نے
بیرق اٹھائی سرمۂ دنبالہ وار نے
(نقش لکھنوی)

کڑکیں وہ کمانیں وہ ہوا فوج کا کڑکا
تیغوں کی سفیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا
گہہ بجھ گیا خورشید کا شعلہ، کبھی بھڑکا
ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑکا
نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے دغا ہے
گھوڑے بھی بھڑکتے تھے کہ شیروں سے دغا ہے
دانتوں میں شجاعانِ عرب ڈاڑھیاں دابے
وہ صورتیں خونخوار، وہ گھوڑے دو رکابے
وہ گردنیں وہ سر تھے کہ معکوس قرابے
وہ آگ کے پتلے تھے تو شبدیز شتابے
خوش آلِ محمدؐ کا بہایا تو انھیں نے
سادات کے خیموں کو جلایا تو انھیں نے
(انیسؔ)

مرثیہ نگار اپنی قوت متخیلّہ اور مبالغہ آمیزی سے جنگ کے بیان کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ الفاظ جوش کھاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ مرثیہ نگاروں کی خوبی ہے کہ انھوں نے کربلا کے واقعات کے بیان کو تاریخیت کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی عطا کی ہے۔ وہ انتہائی فنکاری سے شاعری کے فنی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے آلات حرب کی بھی تفصیل بیان کرتا ہے اور جنگ مغلوبہ کی منظر کشی بھی کرتا ہے:

''چار آئینہ'' پر آئتیں مصحف کی تھیں مرقوم
قرآن کے وہ چار ورق ہوتے تھے معلوم
اور ایسی ''زرہ'' پہنے تھا وہ خاصۂ قیوم
ہر حلقہ پہ جو چشم ملک ہوتی تھی مفہوم
'دستانے' بھی وہ دست مبارک میں چڑھے تھے
جو دست یداللہ میں خیبر میں چڑھے تھے

تھا ہاتھ میں نمازی کے وہ 'دستانہ شمشیر'
جس میں نظر آتی تھی سدا فتح کی تصویر
اور ایسی 'سپر' باندھے تھا وہ صاحب توقیر
جس پر نہ کرے برق کی 'تلوار' بھی تاثیر
غارت کن کفارہ وہ بدلی تھی سپر کی
اور آتی تھی پھر اس سے مہک باغ ظفر کی

تھا قہر خدا 'نیزۂ' عباس دلاور
سوراخ اسی کے ہیں فلک پر، نہیں اختر
'بوڑی' سے تزلزل تھا سدا گاؤ زمیں پر
پرچم تھے فزوں عقد ثریا سے فزوں تر
تھی چوب میں 'نیزے' کی لچک برق سے افزوں
اور نوک میں اس کی تھی چمک برق سے افزوں

تھا حلقہ بگوش ایک جہاں اُس کی 'کماں' کا
پست اس نے کیا مرتبہ سب کاہکشاں کا
کس طرح نشاں دیجئے 'تیروں' کے نشاں کا
واں تک نہ ہو داخل کبھی وہم و گماں کا
جس وقت نکل آتے تھے قندیل سے وہ تیر
تھے تیز پری میں پر جبریل سے وہ تیر
(دلگیر)

مذکورہ بندوں میں دلگیر نے آلاتِ حرب کی تفصیل بیان کی ہے۔ مرثیہ نگار ہر ایک کے ہتھیاروں کی صفات علاحدہ علاحدہ بیان کرتا ہے۔ مرثیہ کے علاوہ شاید ہی کسی رزمیہ میں اتنا مفصل بیان ہو۔ جنگ مغلوبہ کے وقت مرثیوں میں جس قدر جوش اور ولولہ نظر آتا ہے وہ سامعین کے بھی حوصلے بلند کر دیتا ہے اور جب بین کا وقت آتا ہے تو رقت طاری ہو جاتی ہے۔ میر خلیق عنو و محمد کی لڑائی کے منظر کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

پاس پردے کے یہ زینب جو کھڑی دیکھتی تھی
عون و محمد نے وہاں تیغ کمر سے کھولی
نیزے لے لے کے وہیں فوج ستم ٹوٹ پڑی
برق آسا صف اعدا میں در آئے وہ جری
کشتوں کے پشتے لگے لاشوں پہ لاشے ڈالے
شام کے اَبر سے برسا دیئے خوں کے نالے
بڑے بھائی نے جسے دوڑ کے ماری تر وار
گر پڑا خاک پہ دو ہوکے یکا یک وہ سوار

ان پہ آ جس نے کیا نیزہ و شمشیر کا وار
سامنے سے تھا سلامت، اُسے جانا دشوار
تیغ چھوٹے کی تھی جس شخص کے سر تک پہنچی
خود و چار آئینہ کو کاٹ کمر تک پہنچی
گر سواروں پہ گرے شام کے وہ برق اجل
سو یہ چمکی کہ گئے تنگ کے نیچے سے نکل
گھوڑے دابے ہوئے جاتے تھے ہراساں وہ دَل
خوف سے جانوں کے لشکر میں پڑی تھی ہلچل
شور تھا آج ہیں حیدر کے نواسے لڑتے
ایسے دیکھے ہیں کہیں بھوکے پیاسے لڑتے

(میر خلیق)

مرزا فصیح مرثیوں میں رزم کے بیان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے، وہ اپنے مرثیوں میں جنگ کی تیاریوں کا نقشہ بھی کھینچتے ہیں اور لڑائی کے وقت لڑنے والوں کی نقل وحرکت کو بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ یومِ جنگ پر تیاری کا منظر دیکھئے:

ان میں جس دم صبح عاشورہ عیاں ہونے لگی
لشکر شاہ شہیداں میں اذاں ہونے لگی
اس طرف تدبیر قتل بے کساں ہونے لگی
یاں نمازیں اور کمربندی وہاں ہونے لگی
طبل جنگی کی صدا جس دم سنی معصوم نے
تب لگے تلوار کا حیدر کی قبضہ چومنے
غازیوں نے اُٹھ کے باندھے زین گھوڑوں کو کسا
اسلحہ سجنے لگا ہر اک جوان مہ لقا
جمع ہوکر سامنے شبیر کے باندھا پرا
اپنے مولا سید مظلوم کو مجرا کیا
لے کے مجرا آخری ہر اک رفیق و یار کا
پھر ہوا اسوار بیٹا حیدر کرّار کا
کیا سواری کا کروں شبیر کے عالم بیاں
ہاتھ میں عباس غازی کے تو لشکر کا نشاں
دست راست اکبر علی اور دست چپ قاسم جواں
پیش و پس سارے بہادر بیچ میں شاہ زماں
اس طرح سرور کے تھے غازی وہ سارے آس پاس
چاند کے جیسے نکلتے ہیں ستارے آس پاس

اور میدانِ جنگ کا بیان انیس نے یوں کیا ہے:

صف پر صفیں، پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار، فرس پر فرس گرے
اُٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر یہ پیک، پیک یہ مرکر عسس گرے
ٹوٹے پڑے شکست بنائے ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی رفتار کم ہوئی
چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ

رہ رہ کے ابر شام سے وہ بارش خدنگ
وہ شور صیحۂ فرق اہلق و سرنگ
وہ لُوں، وہ آفتاب کی تابندی، وہ جنگ
پھنکتا تھا دشت کیں، کوئی دل تھا نہ چین سے
اس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسین سے
گھوڑے کی وہ تڑپ، وہ چمک تیغ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آری جو ہوگئیں تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ پھرا لیے تھے کارزار سے
لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی
ساونت بے حواس، ہراساں دھنی، بلی
ڈر تھا کہ لو، حسین بڑھے، تیغ اب چلی
غل تھا، اِدھر ہیں مرحب و عنتر اُدھر علی
کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو، دیکھیے کس کی شکست ہو

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ رزمیہ میں جنگی معرکوں کا بیان تو ہوتا ہے لیکن اس خیر وشر یا حق و باطل کی جنگ کے بیچ اخلاقیات کا درس اور جذبات کی ترجمانی بھی شامل ہوتی ہے۔ مرثیوں میں یہ تمام پہلو نمایاں نظر آتے ہیں جن کا ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ مذکورہ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو مرثیہ دیگر اصناف کے مقابلے میں رزمیہ نظم نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ڈاکٹر جعفر احراری
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اردو ذاکر حسین دہلی کالج
(دہلی یونی ورسٹی)

اسلامی ثقافت کی تشکیل میں
ہندوستانی ثقافت کے عناصر

Islami saqafat ki tashkeel mein Hindustani saqafat ke anaasir by Dr. Jaafar Ahrari, associate Prof. Dept. of Urdu, Zakir Hussain Delhi collage,University of Delhi, Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 15-14.

مسلمانوں کے علمی، ثقافتی اور تہذیبی سرمایے میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے کون سے اجزاء اور عناصر شامل ہیں یعنی اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر وتشکیل میں ہندی ثقافت کا کیا حصہ رہا ہے؟ اس کے بہت سے گوشے اور جہات ہیں۔ لیکن میری یہ مختصر سی تحریر ان عناصر پر مبنی ہوگی جن میں مسلمانوں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہندوستانی علوم وفنون اور اس کے تہذیبی ورثے سے اخذ واستفادہ کیا ہے اور ان کو اپنی ثقافت اور علوم و آداب کا جز بنایا ہے۔

جس طرح انسانی زندگی کی ضروری اشیاء اور سامانوں کا تبادلہ شخصی، ملکی اور بین الاقوامی پیمانے پر ہمیشہ ہوتا آیا ہے اسی طرح آراء، عقائد و افکار اور علوم وفنون کا بھی تبادلہ اور ان کی درآمد و برآمد ہمیشہ رہی ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر (چاہے ماضی کے مختلف ادوار میں ترقی کا معیار کچھ بھی رہا ہو) ملکوں کے درمیان اشیاء اور علوم وفنون کا تبادلہ اور ان سے اخذ واستفادہ عہدِ قدیم سے نوعِ انسانی کا معمول رہا ہے۔ دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں سے ان کی پیداوار ومصنوعات اور ان کے علوم وافکار اور ان کے تہذیبی اور تمدنی مظاہر سے اخذ و استفادہ نسلِ انسانی کی ہمہ جہتی اور ترقی کے لیے ضروری رہا ہے۔

رومن امپائر جو اپنی ایک قدیم اور شاندار تاریخ رکھتی ہے، اپنی فوجی صلاحیت اور اداری وانتظامی اہلیت کے اعتبار سے اپنے زمانے میں غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی لیکن علوم وفنون اور افکار ونظریات سے اس کا دامن خالی تھا، اس کے اقل وقلیل افراد میں خطابت، شاعری اور فنونِ لطیفہ کی جو واقفیت پائی جاتی تھی وہ یونان سے مستفاد اور اس کی مرہونِ منّت تھی۔ تقریباً دوسو سال قبل مسیح جب اپنی فوجی اور حربی صلاحیت میں ممتاز وفائق ہونے کی وجہ سے یونان پر اپنا اقتدار قائم کیا اور اس کو اپنی مملکت کا ایک جز بنایا تو یونانی علوم وفنون اپنی جملہ اقسام وفروعات کے ساتھ رومی سوسائٹی میں پھیلے اور رومن حکومت علم وفن اور آداب وثقافت میں بھی ایک ممتاز درجہ تک پہنچ گئی۔ یونانی علوم وثقافت کے رومی مملکت میں داخل ہونے کی دوسری راہ اسکندریہ تھی۔ سکندر مقدونی کے ہندوستان سے واپسی پر عراق میں انتقال کے بعد اس کے جنرلوں نے اس کی وسیع سلطنت کے مختلف حصّوں پر اپنا قبضہ جمایا اور اس سلسلے سے اس کے ایک یونانی جنرل بطلیموس نے مصر پر قبضہ کیا اس وقت آگسٹر سیزر کے زمانے تک یونان کے اس بطلیموسی خاندان نے مصر پر فرماں روائی کی ہے۔ اس خاندان نے یونانی علوم وفنون اور اس کے آداب وثقافت کو اسکندریہ منتقل کیا۔ مشہور اور تاریخی کتب خانہ اسکندریہ جو علومِ عقلیہ اور علومِ تجربیہ اور حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں سے متعلق یونانی افکار وخیالات کی کتابوں کا مرکز بن گیا اور بعد میں اس کتب خانے نے علوم وفنون کی

اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کتب خانہ صرف ایک لائبریری نہیں تھا بلکہ یہ اعلیٰ تعلیم کی ایک یونیورسٹی بھی تھا اور علم وتحقیق کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے ایک اکیڈمی بھی۔ آگسٹر سیزر نے جب اپنے آخری حریف انٹونی اور اس کی داشتہ یا بیوی بطلیموسی خاندان کی آخری ملکہ کلیوپٹرا کو شکست دی ہے تو اس دن سے مصر باقاعدہ رومی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا اور اس کتب خانے کے ذریعے یونانی علوم وثقافت، رومی مملکت میں عام ہوئے اور اس طرح رومن امپائر ہمہ جہتی، ترقی کے ایک بلند معیار پر پہنچ گئی۔

دینِ اسلام جس کے ہم پیرو ہیں، نبیِ کریمؐ کے ذریعے سب سے پہلے اس کی اشاعت عرب میں ہوئی۔ اس دین کے اوّلین مخاطب عرب تھے۔ قبلِ اسلام عربوں کی تاریخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے نام سے ان کے یہاں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ قرآن جس طرح اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری وحی ہے اسی طرح قرآن عربی زبان کی پہلی کتاب ہے اس لیے لازمی طور پر اسلام سے پہلے عربوں کے پاس علوم وفنون اور منظّم آراء و افکار کا کوئی مدوّن مجموعہ جسے کتاب کہا جاسکے نہیں تھا۔ انسانی ضرورت اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جن منتشر اور متفرق اور ضروری معلومات کی ان کو ضرورت تھی وہ زبانی اور روایتی طور پر ان کے پاس محفوظ تھی اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ تیراندازی اور شہسواری کسی انسان کے معیاری ہونے کے لیے ان کے یہاں کافی تھی۔ امثال وحِکم اور شاعری کا بھی پتا چلتا ہے اور اسی طرح علاج ومعالجے کا بھی ان میں رواج تھا لیکن ان میں سے کسی چیز نے منظّم ومرتّب اور مدوّن ہوکر علم اور فن کا درجہ نہیں اختیار کیا تھا۔

زبان اور اس کی مشہور صنف، شعروشاعری سے ان کو ضرور دلچسپی تھی اور ان میں خطابت بھی تھی اس لیے ان کے یہاں شاعری بہت ہی واضح اور نمایاں شکل میں موجود تھی۔ زبان کے معاملے میں وہ بڑے حساس تھے اسی وجہ سے وہ اپنے علاوہ دوسروں کو زبان کے معاملے میں کمتر سمجھتے تھے، یہ ان کا ثقافتی ورثہ تھا آنحضورؐ کی تعلیمات اور ہدایات نے جن کا سرچشمہ وحیِ الٰہی اور کتاب اللہ تھی، ان کو نئی مذہبی اور دینی ثقافت سے روشناس کیا، وہ ایمان لائے اور مسلمان کہلائے اور شرک وبُت پرستی سے توبہ کی، اپنے اعمال میں نبوی احکام پر عمل کیا اور اس کے نتیجے میں ایک مہذب اور شائستہ قوم دنیا کے سامنے آئی۔ آنحضورؐ کے وصال کے وقت ان کے پاس دینی حیثیت سے ایک مکمل صحیفہ قرآن تھا اور دوسرا سنتِ نبوی اور اس معاملے میں ان کو کسی سے کچھ لینا نہیں تھا بلکہ دینا تھا۔ آنحضورؐ کے وصال کے بعد چند برسوں کے اندر انتہائی حیرت انگیز طریقے سے انھوں نے ایران کی ساسانی حکومت کو بالکلیہ شکست دے دی اور اس کے حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ بن گئے اور رومی سلطنت کو اس کے زرخیز علاقوں شام ومصر سے بے دخل کردیا۔ ان کی مقبوضات میں اب صرف جزیرہ نمائے عرب ہی نہیں تھا بلکہ ساسانی حکومت کے پورے مقبوضات جو مدائن سے دریائے جیحون تک پھیلے ہوئے تھے، شامل ہوگئے اور شمال مغرب میں شام ومصر بھی اسلامی حکومت کا جز بن گیا۔ اب اسلامی مملکت میں ایک تہذیب، ایک ثقافت اور ایک مذہب کے حاملین اور قائلین نہیں رہ گئے تھے، مجوسی، بودھ، ستارہ پرست، ملحدین اور یہود ونصاریٰ اس مملکت کے باشندے تھے اور ان سب کی الگ الگ مذہبی عقائد وروایات کے ساتھ الگ الگ ثقافت اور تہذیب تھی، قیصر وکسریٰ سے حاصل کیے ہوئے مفتوحہ ممالک میں علومِ عقلیہ اور تجربیہ کے جاننے والے اور اسی طرح حیاتِ انسانی سے متعلق دوسرے علوم وفنون کے ماہرین اور فضلاء موجود تھے۔ ان کے مقبوضات میں اسکندریہ تھا جو ایک زمانے تک مشرق ومغرب میں یونانی اور عقلی علوم کے پھیلنے کا ذریعہ بنا۔ مسلم حکومت کے مقبوضات میں تہران، نصیبین، رہا اور جندیسابور تھے جہاں پانچ چھ سو سال سے علمِ طب، علمِ نجوم، علم الاعداد و الحساب اور دوسرے علومِ عقلیہ کے فضلاء موجود تھے۔ جنگوں اور فتوحات کے اثرات اور ان کی شدت ختم ہونے کے بعد جب اطمینان اور سکون کا زمانہ ہوا تو تبادل ثقافتی اور علوم وآداب کے لین دین کا عمل شروع ہوا، مسلمانوں کے پاس مذہب تھا اور جامع اور مکمل صورت میں تھا اس لیے ظاہر ہے دین و مذہب سے متعلق معلومات کے لیے ان کو کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ان کو فنِ طب کی ضرورت تھی، فنِ نجوم کی ضرورت تھی، علم الاعداد و الحساب کی ضرورت تھی اور ابتداء ان ضرورتوں نے ان کو مجبور کیا کہ ان علوم سے متعلق مستند علماء اور فضلاء سے جو مسلمانوں میں موجود نہیں تھے، استفادہ کریں اور ان مستند کتابوں سے بھی فائدہ اٹھائیں جو ان علوم سے متعلق دوسری زبانوں میں ہیں اور اس استفادے کی واحد شکل یہ تھی کہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے چنانچہ یہ عمل جزئی اور انفرادی طور پر بنی اُمیّہ کے عہد میں شروع ہوا۔ تاریخی روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور پوری وسعتِ قلب کے ساتھ غیر مسلموں سے ان علوم میں استفادہ کیا اور ان کے ترجمے کا حکم دیا۔

اموی عہد میں اس سلسلے میں جزئی اور انفرادی کام ہوئے۔ طب اور کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے اگرچہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ مسلمانوں نے فتح کرلیا تھا لیکن سندھ سے اموی پایۂ تخت دمشق کی دوری کی وجہ سے مسلمانوں اور سندھیوں کے باہمی اختلاط کے مواقع کم رہے اس لیے افادہ واستفادہ کا عمل بھی بہت ہی قلیل اور مختصر رہا ہے لیکن عباسی عہد میں جب

کہ خلیفہ منصور کے زمانے میں بغداد کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اب اسلامی حکومت کا دارالسلطنت عراق، عجم میں آ گیا اور سندھ، بغداد کا فاصلہ کم ہوگیا۔ ۱۴۲ھ میں عباسی خلیفہ منصور نے ہشام بن عمرو تغلبی کو سندھ کا گورنر بنایا اور اس نے کابل وکشمیر کو بھی فتح کیا۔ اب اس کے گورنروں اور ہندوستانیوں کے درمیان اختلاط اور آمدورفت میں اضافہ ہوا اور درحقیقت اسی زمانے سے زیادہ واضح اور نمایاں طور پر ہندی ثقافت اور ہندی علوم وفنون وآداب کا اثر مسلم ثقافت پر ہوا ہے۔ ہمیشہ سے عربوں نے ہندوستان کو اہمیت، اہلیت اور اعتراف کی نظر سے دیکھا ہے اور ہندوستان کو علمی وثقافتی حیثیت سے اہم مقام دیا ہے۔ مشہور مصنف جاحظ نے لکھا ہے کہ علم الحساب، علمِ نجوم، علمِ طب، مجسمہ سازی، فنِ تصویر کشی اور بہت سی قابلِ ذکر صنعتوں میں ہندوستانیوں کی مہارت مشہور ہے۔ مسعودی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب 'مروّج الذہب' میں لکھا ہے کہ ہندوستان قدیم زمانے سے حکمت اور علومِ عقلیہ میں درجۂ کمال پر ہے اور ہندوستانی اپنی فکری، سیاسی اور تجرباتی امور میں دوسری قوموں سے بہت ممتاز ہے۔ اسی طرح اصفہانی نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کو علم الحساب، علمِ طب، مجسمہ سازی، تلوار سازی، موسیقی اور شطرنج کا غیر معمولی علم اور مہارت ہے۔ قفطی نے اپنی کتاب 'تاریخ الحکماء' میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے فلسفہ اور دیگر علوم وفنون میں ان کی مہارت کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔

ہمیشہ سے عربوں نے ہندوستان کو اہمیت، اہلیت اور اعتراف کی نظر سے دیکھا ہے اور ہندوستان کو علمی وثقافتی حیثیت سے اہم مقام دیا ہے۔ مشہور مصنف جاحظ نے لکھا ہے کہ علم الحساب، علمِ نجوم، علمِ طب، مجسمہ سازی، فنِ تصویر کشی اور بہت سی قابلِ ذکر صنعتوں میں ہندوستانیوں کی مہارت مشہور ہے۔ مسعودی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب 'مروّج الذہب' میں لکھا ہے کہ ہندوستان قدیم زمانے سے حکمت اور علومِ عقلیہ میں درجۂ کمال پر ہے اور ہندوستانی اپنی فکری، سیاسی اور تجرباتی امور میں دوسری قوموں سے بہت ممتاز ہے۔ اسی طرح اصفہانی نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کو علم الحساب، علمِ طب، مجسمہ سازی، تلوار سازی، موسیقی اور شطرنج کا غیر معمولی علم اور مہارت ہے۔ قفطی نے اپنی کتاب 'تاریخ الحکماء' میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے فلسفہ اور دیگر علوم وفنون میں ان کی مہارت کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ علمِ ریاضی اور طب میں ہندوستان کو ایک بلند مقام حاصل تھا اور اسلامی حکومت کے دائرے کی وسعت کی وجہ سے مسلمانوں کو علمِ طب، علمِ نجوم اور علمِ ریاضی کی شدید ضرورت تھی اس لیے مسلمانوں نے اپنے ابتدائی عہد میں ان ہندی علوم سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنے علم وثقافت میں اس سے مدد لی، یہاں تک کہ ہندی علوم وفنون کے یہ حصّے مسلم ثقافت میں گھُل مل گئے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہندی ثقافت کا داخلہ تین راہوں سے ہوا ہے اور ان کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

(۱) ایران اور ہندوستان ایک دوسرے کے قریب تھے اور حسنِ اتفاق کہ ایران اور ہندوستان کے درمیان خشکی کا راستہ تھا سمندر کا نہیں کیونکہ عام طور پر اس زمانے میں سمندر کے سفر کو ہندو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ان ملکوں کے درمیان قربِ مسافت کی وجہ سے تہذیبی اور ثقافتی تبادلے ہوئے ہیں اور خاص طور پر بودھ مذہب جب ہندوستان سے باہر شمال مشرق میں تبت، چین یہاں تک کہ برما اور جاپان میں پہنچا ہے اور شمال مغرب میں کشمیر، افغانستان، خراسان اور سمرقند وبخارا تک پہنچا ہے تو عرصے تک اس مذہب کو ماننے والے ایرانی حکومت کے مقبوضات میں مقیم رہے ہیں۔

بلخ کا مشہور معبد نوبہار جس کے متولی اور منتظم برامکہ تھے، خراسان میں تھا۔ اس طرح ہندوستانی تہذیب وعلوم کا بودھ مذہب کے ماننے والوں کے ذریعے داخلہ ایران میں بھی ہوا اور وہ ایرانی ثقافت کا جز بنے اور جب عباسی سلطنت کے قیام کے بعد مسلم عرب ثقافت میں ایرانی ثقافت داخل ہوئی ہے تو اس وقت ایرانی ثقافت کے ساتھ ساتھ ہندی ثقافت کے وہ عناصر بھی مسلم ثقافت میں داخل ہوئے جو ایرانی ثقافت کا جز ہو چکے تھے۔ اس کی واضح مثال 'کلیلہ دمنہ' ہے۔ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ فارسی زبان سے عربی میں کیا اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس کے بعض ابواب کو چھوڑ کر اس کا بڑا حصّہ ہندوستان سے ایران پہنچا تھا اور وہاں فارسی زبان میں ترجمہ ہوا اور پھر فارسی زبان سے ابن المقفع نے عربی میں منتقل کیا۔ ہندی ثقافت کا اثر اسلامی ثقافت پر بالواسطہ ہے اور مورّخ کے لیے یہ کام بہت مشکل ہوگا کہ ایرانی ثقافت کا تحلیل وتجزیہ کر کے ہندی ثقافت کے عناصر کی نشان دہی کرے اور پھر بتائے کہ یہ عناصر ایرانی ثقافت کی راہ سے مسلم ثقافت میں داخل ہوئے۔

(۲) محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے کے بعد بہت سے

سندھ کے باشندے مسلمان ہوئے ہیں اوران کی ایک تعداد دمشق اورعرب کے دوسرے شہروں میں پہنچی ہے اوراسی طرح فتحِ سندھ کے بعدعرب ملکوں میں سندھی باندیوں کا داخلہ بھی ہوا ہے، یہ بھی ہندی تہذیب وتمدن کے عربوں کے تہذیب وتمدن میں داخلے کا ذریعہ ہوا ہے۔ان نومسلم مردوں میں سے بعضوں نے اسلامی علوم وفنون بھی حاصل کیے اوراسلام کی دینی ثقافت میں اضافے کا ذریعہ بنے مثلاً بعض سندھی الاصل نومسلموں کا شمار محدثین میں ہے یہاں تک کہ بعض ہندی الاصل کا نام ہمیں عربی شعرا کی فہرست میں ملتا ہے۔ابوعطاء سندھی، اموی اورعباسی عہد کے شاعروں میں ہیں اوران کے اشعار کا کچھ حصّہ آج تک عربی ادب کی تاریخوں میں محفوظ ہے۔اسی طرح ابن الاعرابی کا علم وادب اورشاعری میں بہت بڑا مقام ہےاوران کے باپ کا اسلامی نام زیادتھا۔سندھی غلام کی حیثیت سے وہ عرب میں آئے اوران کے لڑکے ابن الاعرابی نے غیرمعمولی شہرت حاصل کی۔ابن الاعرابی کے مشہور شاگردوں میں ثعلب اورابن السکیت ہیں اوران دونوں کا تلمّذ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ابن الاعرابی کا عربی زبان وادب اورشعر میں کیا درجہ اور مقام تھا۔اسی طرح ابومعشر نجیح سندھی فنِ حدیث اورخاص طور پرمغازی سے متعلق احادیث جاننے میں ان کا بلند مقام ہے۔مشہورصحابی حضرت عبداللہ ابن عمرو کے مشہورشاگرداورغلام حضرت نافع اوردوسرے علمائے تابعین کے یہ شاگردوں میں ہیں۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ سندھ کے باشندے مالی معاملات اورحساب وکتاب رکھنے میں بڑے ماہراوروواقف کارہوتے ہیں اور یہی جاحظ آگےلکھتا ہے کہ بصرہ میں ہرصرّاف کا خزانچی سندھی ہوتا ہے۔

(۳) تیسراذریعہ براہِ راست ہندوستانی علوم وفنون کا مسلم عرب ثقافت میں داخلہ ہے، میری مراداس سے یہ ہے کہ خاص ہندوستانی علوم وفنون اوران کی کتابیں مسلم ثقافت میں داخل ہوئی ہیں اوران کا داخلہ کس طرح ہوا اورکون کون ہندوستانی علوم عرب ثقافت میں شامل ہوئے اس کی تفصیل خاصی طویل ہے۔مولانا سیّدسلیمان ندوی نے اپنی محققانہ کتاب 'عرب وہند کے تعلقات' میں ہندوستانی علوم وفنون کے عرب مسلمانوں کے یہاں پہنچنے کی تاریخ وکیفیت اورعربوں کے ان اعترافات کی تفصیلات بیان کی ہیں جوانھوں نے ہندوستانی علوم وفنون کی اہمیت وافادیت اور ہندوستانی علماءوفضلاء کی اپنےفنون میں مہارت کے متعلق ذکر کیے ہیں۔ان سب کوسیّد صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ میں اس وقت اس کتاب کے دو حوالے تحریرکروں گا یہ حوالے گرچہ ذراطویل ہیں لیکن موضوعِ بحث پر بہت ہی واضح روشنی ڈالتے ہیں چنانچہ وہ کتاب مذکور کے صفحہ۱۲۴ پر بعنوان 'سنسکرت سے ترجمے کا آغاز' تحریرفرماتے ہیں:

''عربوں میں دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمہ کرانے کا خیال پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہوچکا تھا،مگرچوں کہ اب تک حکومت کا مرکز شام تھا اس لیے یونانی وسریانی زبانوں کا غلبہ رہا لیکن جب عراق میں عباسی خلافت کا تخت بچھا تو ہندوستان اور ایران کی زبانوں کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ جب منصور کے علم دوستی کا چرچا پھیلا تو ۱۵۴ھ(۷۷۱ء) میں سندھ کے ایک وفد ڈیپوٹیشن کے ساتھ ہیئت اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت سنسکرت کی سدھانت لے کر بغداد پہنچا۔(کتاب الہند، بیرونی،ص۲۰۸،لندن) اورخلیفہ کے حکم سے دربار کےایک ریاضی داں ابراہیم فزاری کی مدد سے اس نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا''۔(اخبارالحکماء، قفطی،ص۱۷۷،مصر)

یہ پہلا دن تھا کہ عربوں کو ہندوستان کی قابلیت اوردفاع داری کا اندازہ ہوا۔پھر ہارون نے اپنے علاج کے لیے یہاں سے وید بُلوائے جنھوں نے عربوں میں ہندوستان کی علمی عظمت اور بڑائی کی دھاک بٹھادی۔اس کے بعد برامکہ کی سرپرستی میں طب، نجوم، ہیئت اور ادب و اخلاق کی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سےعربی میں ہوا۔اس نے ہندوستان کی شہرت اورنیک نامی کواورچارچاندلگادیئے''۔

اسی کے بعدمتّصلاً 'عربوں میں ہندوستان کی وقعت' کےعنوان سے ہندوستانیوں کےمتعلق عربی کےمشہورانشاپرداز اور بہت سی کتابوں کے مصنف جاحظ کا قول نقل فرماتے ہیں:

''لیکن ہندوستان کے باشندے تو ہم نے ان کو پایا ہے کہ وہ جوتش (نجوم) اورحساب میں بڑھے ہوئے ہیں اوران کا ایک خاص ہندی خط ہےاورطب میں بھی وہ آگے ہیں۔اورطب کےبعض عجیب بھیدان کو معلوم ہیں اورسخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور سےان کے پاس ہیں پھرمجسموں اوراسٹیچو بنانا،رنگوں سےتصویر پیدا کرنا اورتعمیر وغیرہ میں ان کوکمال ہے۔ پھرشطرنج کے وہ موجد ہیں جو ذہانت اورسوچ کا بہترین کھیل ہے۔تلواریں عمدہ بناتے ہیں اوران کے چلانے کے سب کرتب جانتے ہیں۔ زہر اتارنے اوردردودورکرنے کےمنتر جانتے ہیں ان کی موسیقی بھی دل پسند ہے، ان کے ایک ساز کا نام کنکلہ ہے جوکدو پرایک تارکوتان کر بجاتے ہیں اور

جوستار کے تاروں اور جھانجھ کا کام دیتا ہے۔ان کے ہاں ہر قسم کا ناچ بھی ہے۔ان کے ہاں مختلف قسم کے خط ہیں۔شاعری کا ذخیرہ بھی ہے اور تقریروں کا حصّہ بھی ہے۔طب، فلسفہ اور ادب واخلاق کے علوم بھی ان کے پاس ہیں۔انھیں کے ہاں سے 'کلیلہ دمنہ' کتاب ہمارے پاس آئی۔ ان میں رائے اور بہادری اور جو بعض خوبیاں ان میں ہیں چینیوں میں بھی نہیں۔ ان میں صفائی اور پاکیزگی کے بھی اصاف ہیں۔خوبصورتی، نیک نیتی اور خوش قامتی اور خوشبوئی بھی ہے اور انھیں کے ملک سے بادشاہوں کے پاس وہ عود آتی ہے جس کی نظیر نہیں اور فکر کا علم انھیں کے پاس سے آیا ہے اور ان کو ایسے منتر معلوم ہیں جن کو یہ زہر پر پڑھ دیں تو زہر بیکار ہو جائے پھر نجوم کے، حساب کے وہی موجد ہیں۔ان کی عورتوں کو گانا اور مردوں کو پکانا خوب آتا ہے۔صرّاف اور روپے کے کاروبار کرنے والے اپنے پیسے اور خزانے ان کے سوا اور کسی کے حوالے نہیں کرتے جتنے (عراق میں) صرّاف ہیں سب کے ہاں خزانچی خاص سندھی کا لڑکا ہوگا کیوں کہ ان کو حساب وکتاب اور صرّافی کے کاموں سے فطری مناسبت ہے پھر یہ ایماندار اور وفادار ملازم بھی ہوتے ہیں''۔

(رسالہ فخر السودان علی البیضان جاحظ، مجموعہ رسائل جاحظ، ص۸۱، مطبوعہ۱۳۲۴ھ، مصر)

ان دو طویل حوالوں کے بعد اب میرے نزدیک دو تین اور ضروری باتیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

ہندوستانی علوم وفنون کے اسلامی مملکت میں داخل ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ برامکہ ہیں اور جیسا کہ یہ بات تحقیق سے معلوم ہو چکی ہے کہ یہ خاندان ہندی الاصل والنسل ہے اور بلخ کے مشہور معبد نوبہار کا اسلام لانے سے پہلے متولی اور منتظم رہا ہے اور یہ معبد بودھ مذہب والوں کا خراسان کے علاقے میں بہت بڑا مرکز تھا اس لیے برامکہ کو ہندوستان اور اس کے علوم و فنون کی اہمیت و نافعیت کا اچھی طرح علم تھا اور وقتاً فوقتاً مختلف مواقع سے ہندو علماء وفضلاء کو دربارِ خلافت میں بلائے جانے کی تقریب پیدا کرتا تھا۔ ہارون رشید کا چچازاد بھائی جب بہت بیمار ہوا ہے اور یونانی فنِ طب کے ماہرین اور اطباء نے مایوسی ظاہر کی ہے تو یحییٰ بن خالد برمکی کے مشورے سے ہندوستانی طبیب علاج کے لیے بلایا گیا اور اس کے علاج سے مریض تندرست ہوا اور یہ علاج اس بات کی تقریب ہوا کہ اس دارالترجمہ میں ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کی خدمت لی جائے۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے ہندوستانی مذاہب پر ہندی مصنف سے کتاب لکھوائی، یہ کتاب اگرچہ اب ناپید ہے لیکن چوتھی صدی ہجری تک موجود رہی ہے اور ابن الندیم نے اپنی مشہور کتاب 'الفہرست' میں جو ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے، اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔

بہلا ہندی، منکا ہندی صالح بن بہلہ اور ابن دہن کے نام ان ہندی علماء اور فضلاء میں آتے ہیں جنھوں نے عربوں میں علم و ثقافت کو پھیلایا۔صالح بن بہلہ وہی شخص ہے جس کو جعفر بن برمکی نے ہارون رشید کے چچازاد بھائی کے علاج کے لیے پیش کیا تھا جب کہ عیسائی طبیب جبرئیل بختیشوع نے مایوسی ظاہر کر دی تھی۔ابن دُہن، برامکہ کے قائم کردہ شفاخانے کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ان ناموں کا اصل ہندی تلفظ کیا ہے اور اصل ہندی میں یہ نام کیا ہیں اس کا پتا لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے، ان ماہرین فضلاء کے نام عربی کتابوں سے حاصل کیے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ عربوں نے ان ناموں کو اپنے لہجے اور تلفظ کے مطابق بنانے کے لیے تبدیلی کی ہے۔ وہ خاص علوم جو براہِ راست مسلم عرب ثقافت میں ہندوستانیوں سے پہنچے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) علم الحساب والاعداد جس کو غلطی سے علم الہندسہ کہا جاتا ہے (۲) علمِ نجوم و ہیئت۔عربی علمِ نجوم و ہیئت میں بعض ہندی اصطلاحات آج تک رائج ہیں (۳) علمِ طب (۴) علم بیطاری یعنی جانوروں کے علاج کا علم (۵) زہروں کا علم (۶) موسیقی (۷) علم السیاسہ (۸) منتر، کرتب اور جادو (۹) کہانی اور افسانے اور اخلاق وحکمت ہیں۔

ان علوم وفنون پر مشتمل ہندی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے اور ان کے مترجمین ہندوستانی تھے۔ میں صرف ایک واقعہ تحریر کرنا چاہوں گا کہ عباسی خلیفہ منصور کو پُرخوری کی وجہ سے سوئے ہضم کی شکایت ہو گئی تھی اور یونانی طب کے ماہرین اطبّاء اس کے علاج سے عاجز آ گئے تھے، اس وقت اس کا علاج ہندوستانی طبیب نے کیا۔ ہندوستانی فضلاء کا ایک وفد ۱۵۴ھ میں منصور کے دربار میں آیا اور اس وفد میں فلکیات کا ایک بڑا ماہر ہندوستانی تھا اور اس کی اس فن کی مشہور کتاب 'سدھانت' تھی جو فلکیات کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔منصور کے حکم سے اس کتاب کا عربی زبان میں ابراہیم بن حبیب فزاری نے ترجمہ کیا اور اسی کتاب کے اصول پر زیچ تیار کی گئی اور یہ کتاب وزیچ ہی مسلمانوں میں عہد مامونی تک معمول بہ رہی ہے۔

●❖●

ڈاکٹر احمد امتیاز
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو میں ادبی ترجمے کی روایت

Urdu mein adabi tarjume ki riwayat by Dr. Ahmad Imtiyaz Assistant Prof. Dept. of Urdu,University of Delhi, Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 20-26.

ادبیاتِ عالم میں 'طبع زاد' اور 'ترجمہ' کی اصطلاحیں رائج ہیں۔عام طور پر انہیں ایک دوسرے کی ضد بھی سمجھا جاتا ہے۔ترجمہ چوں کہ دوسری زبان سے ماخوذ یا مستعار ہوتا ہے اس لیے اس میں ایک حد تک غیریت کا احساس باقی رہتا ہے۔اس غیریت کے احساس کے سبب ہی 'طبع زاد' کے مقابلے 'ترجمہ' کو ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔لیکن دوسرے فنون کی طرح ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے اور ادب میں اس کی حیثیت مسلم ہے۔ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کے بغیر دوسری زبانوں کے علوم وفنون سے آشنائی نہیں ہوسکتی اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔ترجمہ ہی وہ فن ہے جس کے ذریعے سے ایک قوم دوسری قوم کے ذخیرۂ علم وادب سے آشنا ہوتی رہی ہے۔

ترجمہ کی تعریف مختلف اصحابِ فن نے مختلف انداز سے کی ہے۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔بعض کی نظر میں ترجمہ کسی متن (text) کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اس کی تعبیر پیش کرنا ہے۔بعض حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔گوکہ ترجمہ کی تعریف مختلف انداز سے کی گئی ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ ترجمہ نگاری کا عمل ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں مترجم اپنے آپ کو مصنف اور متن کے درمیان سے ہٹالیتا ہے یعنی مصنف ماضی کی آواز کو اپنے عہد میں شامل کرلیتا ہے مگر خود کو درمیان میں نہیں لاتا۔ترجمہ نگاری کے فن کے حوالے سے یہ بھی خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ جس طرح اداکار، گلوکار یا موسیقار لکھے ہوئے جملوں کو آواز یا اشارہ فراہم کرتا ہے اسی طرح مترجم بھی لکھے ہوئے مضمون یا متن کو ایک نیا لباس پہناتا ہے اور اس کی صورت کو بدل کر اس میں ایک نئی روح ڈالتا ہے۔اصل متن کی داخلی ساخت، آہنگ و اسالیب کو برقرار رکھتے ہوئے اسے دوسری زبان میں منتقل کرنا بہت مشکل کام ہے۔اس لیے ترجمہ کے فن کو ایک پیچیدہ اور پُر اسرار فن بھی قرار دیا گیا ہے۔بغور دیکھا جائے تو اس عمل میں ایک شخصیت دوسری شخصیت میں ڈھلتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہی وہ معیار ہے جس پر مترجم کو ایک فنکار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ترجمہ کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے Abbe Galiani نے لکھا ہے کہ

> ''اچھا ترجمہ وہ ہے جو اصل کے ساتھ موازنہ کیے بغیر پڑھا جاسکے۔''

ترجمہ کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ اصل متن سے زیادہ دلکش ہو اور اس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہو کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد تحریر ہے۔اس معیار سے دیکھا جائے تو ترجمہ ایک مشکل ترین آزمائش بن جاتا ہے اور یہ خصوصیت پیدا کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوسکتا۔ایک معروف مترجم پروفیسر عبدالرؤف نے انہیں مشکلات کے پیشِ نظر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ

> "Translation is like a young girl, if faithful not beautiful, if beautiful not faithful."

ترجمہ کو کامیاب اور دلکش بنانے کے لیے اصل عبارت کی خوبی اور مطلب کو جوں کا توں باقی رکھنا بے حد ضروری ہے۔عام طور پر ایسا دیکھنے کو نہیں ملتا لیکن اردو میں بعض ایسے ترجمے ضرور ملتے ہیں جن میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔دنیا کی مختلف زبانوں کے علوم وفنون کو اردو زبان میں منتقل کیا جاتا رہا ہے جس سے ہمارے ادبی سرمایے میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن اچھے اور

کامیاب ترجمے کی کمی اکثر محسوس کی جاتی رہی ہے اور کامیاب ترجمے خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ترجمہ کے فن کی پیچیدگی اور مشکلات کے سبب اردو ادب میں ترجمہ کی کمی کا احساس ہمیشہ سے باقی رہا ہے۔

ترجمہ نگاری کے ذیل میں ادبی ترجمہ کو بھی خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ادبی تراجم میں ادبی محرکات اور ادبیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔غیر ادب کے ترجمے میں اصل متن اپنا مخصوص معنی دینے کے بعد اپنا تاثر کھو دیتا ہے جب کہ ادبی ترجمے میں اصل متن اپنا مخصوص معنی دینے کے باوجود زندہ رہتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادبی تخلیقات کا ترجمہ کسی بھی دوسری تحریر کے ترجمے سے زیادہ مشکل مگر دلکش ہوتا ہے۔ادبی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت الفاظ اور اس کے مفہوم کے ساتھ ساتھ اس تہذیبی سیاق کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے جن میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ادبی تراجم میں نثر سے زیادہ نظم کے ترجمے میں دقت پیش آتی ہے۔نثری متون کے مفہوم تک رسائی جس طریقۂ کار یا اصول کے تحت ہوتی ہے اس کے بالکل برعکس نظم کے ترجمے وجود میں آتے ہیں۔اس لیے کہ نظم کی قواعد اصولی اعتبار سے بالکل جدا ہوتی ہے۔دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ نظم کی تعمیر تخیل، محاکات اور جذبات کے اتار چڑھاؤ سے ہوتی ہے جب کہ نثر کی تعمیر میں جذبات کی شدت اور تخیل کی پرواز کا گراف بہت سطحی ہوتا ہے۔اب تک ادبی تراجم کے بہت سے نمونے وجود میں آچکے ہیں جن سے ہمارے ادبی سرمایے میں بیش بہا اضافے ہوئے ہیں۔غیر ملکی زبانوں کے ادبی ترجمے سے لیکر خود اپنے ملک کی بیشتر زبانوں کے ادب کا ترجمہ بھی وجود میں آتا رہا ہے جن سے فکر میں توسیع ہوئی ہے۔

'Translation' لاطینی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی 'ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا یا پار لے جانا، کے ہیں۔عربی، فارسی اور اردو لغات میں اس کے معنی، دوسری زبان میں نقلِ کلام، تفسیر وتعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان، احوال یا تذکرہ، درج ہیں۔فارسی اور اردو میں یہ لفظ عربی کے توسط سے آیا ہے۔لاطینی زبان کے ادبیات جب عربی زبان میں منتقل ہوئے تو عرب والوں نے لفظ 'Translation' کے لیے 'ترجمہ' کا لفظ اختراع کیا۔اشتقاقِ لفظی کے اعتبار سے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ لفظ 'تُرجُمُ' سے بنا ہے جس کے معنی التباس کرنا یا خلط ملط کرنا، کے ہیں۔بعض علماء کے نزدیک اس کا اشتقاق 'تَرجُمُ' ہے جس کے معنی مشکوک یا مخلوط کے ہیں۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ 'رَجِمُ' سے ماخوذ ہے اور بعض اسے 'تَرَجَمَ' سے مشتق قرار دیتے ہیں۔حالانکہ 'رَجِمُ' سے اسے مشتق قرار دینا اس معنی میں درست نہیں ہے کہ اس کے معنی گناہِ کبیرہ کے ہیں۔لفظ 'ترجمہ' کا ماخذ جس عربی لفظ سے قریب تر ہے وہ 'رَجَمَ' یا 'تَرَجَمَ' ہے۔جس کے معنی پتھر یا کنکری مارنے کے ہیں۔حج کے موقعے پر شیطان کو کنکری ماری جاتی ہے۔یہ کنکری شیطان کو اس کی لعنت کی وجہ سے ماری جاتی ہے یا شہابِ ثاقب کی وجہ سے جو اس پر گرتے ہیں۔اس لیے شیطان کو 'رجیم' اور شہابِ ثاقب کو 'رجوم' کہا گیا ہے۔قرآنِ کریم میں اسی لیے فرمایا گیا ہے:

o اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ o

(یعنی جو شیطان آسمان سے کچھ خبر لے کر بھاگتا ہے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔)

ترجمے کا تعلق اصل تصنیف یا عبارت سے تقریباً وہی ہے جو شہابِ ثاقب کا نجوم وکواکب سے ہوتا ہے جس طرح ایک ہی سیارے سے مختلف وقتوں میں ایک سے زائد شہابِ ثاقب نمودار ہوتے رہتے ہیں اسی طرح مختلف ادوارِ ادب میں ایک ہی کارنامے سے بار بار ترجمے نمودار ہوتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح کوئی بھی شہابِ ثاقب حتمی اور آخری نہیں ہوتا اسی طرح کسی بھی ترجمے کو حرفِ آخر نہیں کہا جاسکتا۔غالباً یہی وجہ ہے کہ 'ترجمہ' کو 'رَجَمَ' یا 'تَرَجَمَ' سے مشتق قرار دیا گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں آمد ورفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط واختلاط بڑھتا جارہا ہے اور اس لیے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی ہے۔دوسروں سے استفادہ کرنے کی ایک صورت ترجمہ بھی ہے۔زبان کے پھلنے پھولنے میں بھی ترجمہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔نئی اصنافِ ادب کا ورود ہمیشہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوسکا ہے اس لیے اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ترجمے کی ضرورت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے طور طریقے، مذہب، ادب اور تہذیب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔انسانی تہذیب کی ترقی میں ترجمہ ایک اہم رول ادا کرتا ہے اس لیے قوموں اور زبانوں کے درمیان باہمی افہام وتفہیم اور ربط وضبط کی راہیں کھولنے کے لیے ترجمہ کی ہی مدد لی جاتی ہے۔ادبیات عالم میں تاریخی ادوار اور لسانی تمدن کی شناخت وبازیافت کا واحد ذریعہ ترجمہ رہا ہے۔اس لیے ترجمہ کو اخذ واستفادہ

کی ایک شکل بھی قرار دیا گیا ہے کیوں کہ اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کسی چیز کا فقدان ہو۔اس فقدان کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس چیز کی طرف رجوع نہ کریں۔ رجوع کے ساتھ ہی ذہن ترجمے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس وقت ترجمے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ناواقفیت کی منزل سے گزرتے وقت ترجمے کی ضرورت کا احساس بار بار ہوتا ہے اور اسی کے زیر اثر ترجمے کا فن پروان چڑھتا ہے۔ ترجمے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے نہ صرف الفاظ اور زبان کی نشوونما میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علوم وفنون میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔اس کے ذریعے سے نئے نئے اسالیبِ بیان ظاہر ہوتے ہیں۔دوسری زبانوں کے ذخیرۂ ادب سے آشنائی ہوتی ہے۔زبان کا منصب طے ہوتا ہے۔اسلوبی خصائص اور تہذیبی بوباس کا اندازہ ہوتا ہے۔معاشرتی اور ذہنی تحریکیں ترجمے کے ذریعے ہی وجود میں آئی ہیں اور زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان ایک رشتہ ارتباط قائم ہوا ہے۔ترجمے کے ذریعے ہی آج مشرق ومغرب کے درمیان کی دوری ادبی اور لسانی اعتبار سے کم ہو پائی ہے۔ان کے افکار و خیالات سے آشنائی ہوئی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں اس قدر کامیاب ہو پائے ہیں۔دوسرے ادب کے خزانوں کا سراغ ہمیں ترجمے کے ذریعے ہی مل پایا ہے۔انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے ہم نے جو ترقی اور تعمیر کی ہے وہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوسکا ہے۔بطورِ فن ہم بھلے ہی ترجمے کو طبع زاد کے مقابلے کم تر سمجھتے ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمہ نے کچھ ایسے کام انجام دیے ہیں جو طبع زاد تصنیف بھی نہیں دے سکتی تھی۔چند مثالیں تو ایسی بھی ہیں جنہیں ترجمے کے ذریعے ہی قبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس طبع زاد تصنیف کو شاہ کار کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔اردو زبان وادب میں ادبی تراجم کے ذریعے ہی بہت سی اصناف متعارف ہوئی ہیں۔نثر میں ڈرامہ، ناول، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، مکتوب، رپورتاژ، وغیرہ مغربی ادبیات سے ترجمے کے ذریعے ہی ہماری زبان میں آئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ نظم میں آزاد نظم، ترائیلے، ہائیکو، سیڈوکا، ماہیے، مثلث و دیگر اصنافِ سخن ترجمے کے ذریعے ہی اردو زبان وادب میں آئی ہیں۔مغربی علوم وادبیات کے علاوہ خود مشرقی ادبیات سے بھی ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔عربی، سنسکرت اور فارسی ادبیات کا بہت کچھ سرمایہ ہماری زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔مثنوی اور داستانوں میں ہم نے سب سے زیادہ ان تینوں زبانوں سے استفادہ کیا ہے۔ہائیکو اور سیڈوکا جیسی جاپانی صنفِ سخن تک ہماری رسائی ترجموں کے ذریعے ہی ہو پائی ہے۔گویا ترجمے نے ہمارے ادب کو مختلف انداز سے روشناس کرایا ہے اور اس کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔

ترجمے کی روایت اردو ادب میں مغرب سے آئی ہے۔مغرب میں ترجمے کے بالعموم دو طریقے رائج رہے ہیں۔انہیں دو طریقوں کا عام چلن تقریباً ہر زبان وادب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس لیے اردو میں بھی یہی رائج ہے۔ایک آزاد ترجمہ اور دوسرا لفظی ترجمہ۔بعض اہلِ علم نے ترجمے کے ایک اور طریقے ''بامحاورہ ترجمہ'' کا ذکر کیا ہے،لیکن اس کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ترجمے کا یہ طریقہ غیر معروف ہے اور موجودہ دور میں شاذ و نادر ہی اس کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔اس طریقے کے غیر معروف ہونے یا ناکام ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کے اپنے محاورے اور اس کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جسے کامیابی کے ساتھ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔آزاد ترجمہ میں مترجم اصل متن کے نچوڑ یا مفہوم کو اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے مگر اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ نفسِ مضمون باقی رہے اور اس کی روح مجروح نہ ہو۔لفظی ترجمہ میں مترجم اصل عبارت کے ہر لفظ کا ترجمہ کرتا ہے اور یہاں بھی یہی کوشش پیشِ نظر رہتی ہے کہ نفسِ مضمون باقی اور روح زندہ رہے۔ان دونوں طریقوں میں ایک ہی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے کہ اصل تخلیق کو دوسری زبان کے قارئین تک اس طرح پہنچایا جائے کہ اس کی معنوی اور ظاہری ہیئت میں وحدت قائم رہے۔بعض اصحابِ علم کا خیال ہے کہ مترجم آزاد ترجمہ میں اصل تصنیف کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر پر زیادہ زور دیتا ہے جب کہ لفظی ترجمہ میں اصل متن کی معنویت پیشِ نظر رہتی ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ہم دونوں قسم کے طریقۂ ترجمہ میں فرق کر سکتے ہیں۔دونوں طریقۂ کار کے اپنے اپنے حدود ہیں اور اپنے اپنے مسائل بھی۔بہر حال اردو میں بھی ترجمے کی یہ دونوں قسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔آزاد ترجمہ میں مترجم مفہوم کی ادائیگی کے لیے اپنے لفظیات پر بھروسہ کرتا ہے جب کہ لفظی ترجمہ میں مترجم کو اصل متن کے لفظیات پر ذہنی ورزش کرنی پڑتی ہے۔اس لحاظ سے لفظی ترجمے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں اور آزاد ترجمہ کے مقابلے اس میں نفسِ مضمون کا باقی رکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔اس لیے بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ ادبی تراجم میں مترجم زیادہ تر آزاد ترجمہ کو ہی ترجیح دیتا ہے۔

ترجمہ کی بے شمار مشکلات ہیں اور اس کے مسائل کا احساس بھی ہر کسی کو نہیں ہو پاتا۔ان مشکلات ومسائل کا احساس بھی انہیں حضرات کو ہوتا ہے جنہوں نے سنجیدگی اور انہماک سے اردو میں دوسری زبانوں کی تخلیقات کو ترجمہ کیا ہے یا پھر انہیں جو اصل متن اور تراجم کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ترجمہ کے سلسلے میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش

آتی ہے ۔ یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے اور اس کے لیے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہئیے جو اسی طرح مخصوص معنی دیتی ہو۔ سائنسی اصطلاحات کے علاوہ قانون اور عدالتوں کے فیصلے کے ترجموں میں بھی یہ مشکل دیکھنے کو ملتی ہے۔ادبی ترجمے میں زیادہ مشکل شعری اصطلاحات کے ذیل میں آتی ہے۔اصطلاح سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے اور انہیں جوں کا توں اپنا لینا چاہئے۔مگر یہ فیصلہ درست نہیں ہے کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں ان کو جوں کا توں اردو میں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی۔دوسری بات یہ کہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ اردو میں ان کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب وغریب نظر آئے گی۔ترجمے کی مشکلات کا اندازہ تو اسی سے ہوسکتا ہے کہ کسی غیر زبان کی شاعری کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح کی جائے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کے فنی مزاج اور مخصوص ادبی محاسن سے مرتب ہونے والی فضا بھی برقرار رہے اور ترجمے کے الفاظ سے بھی ویسا ہی اثر مترشح ہو جو اس زبان کی شاعری سے ہوتا ہے۔اس طرح ترجمہ کی دشواری پوری طرح عیاں ہو جائے گی۔ترجمہ کا صحیح درک نہیں ہونے کے سبب فاش غلطیوں کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔انگریزی کے بعض اصطلاحات کے اردو ترجمے یوں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو قطعی طور پر غلط ہیں:

بڑا ہاتھ Big Hand

نیلی چھپائی Blue Print

بند ہونٹ Lip Lock

ننگا معاہدہ Nude Contract

بعض وقت اردو میں متبادل الفاظ ہونے کے باوجود یہ طے کر پانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا لفظ زیادہ مناسب ہے مثلاً انگریزی لفظ Agreement یا Treaty کے لیے اردو میں سمجھوتا یا معاہدہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن یہ طے نہیں ہے کہ Agreement کے لیے معاہدہ اور Treaty کے لیے سمجھوتا ہی استعمال ہوگا ۔ اسی طرح Indipendence,Freedom اور Liberty کے لیے اردو میں حریت یا آزادی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، Power,Force اور Strength کے لیے طاقت یا قوت کا استعمال ہوتا ہے،Probability اور Possibility کے لیے امکان کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن یہ طے نہیں ہے کہ کس کے لیے کون سا لفظ مناسب ہوگا۔ جملوں کی ساخت کے اعتبار سے الفاظ کے معنی بھی بدل جاتے ہیں اس لیے ترجمہ کرتے وقت اس بدلی ہوئی صورت کا احساس اگر مترجم کو نہیں ہے تو پھر ترجمہ اغلاط کا مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔

بعض وقت یہ مشکلات اس وقت پیش آتی ہیں جب اصل متن کے لیے کوئی متبادل الفاظ نہ ہوں۔ایسی صورت میں ماہرین کا خیال ہے کہ اس لفظ کو جوں کا توں لکھ دیا جائے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ لفظی ترجمہ ہر جگہ مناسب بھی نہیں ہوتا۔اقبال نے اپنے ایک شعر میں 'پھول کی پتی' کی ترکیب استعمال کی ہے جو فارسی کے 'برگِ گل' کا اردو ترجمہ ہے۔اس ترجمہ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پھول کی پنکھڑی ہوتی ہے پتی نہیں۔بہر حال اس قسم کی بے شمار مشکلات ہیں جو ترجمہ کرتے وقت سامنے آتی ہیں۔وضع اصطلاحات سے یہ مسائل دور ہوئے ہیں مگر پوری طرح اب بھی چھٹکارہ نہیں ملا ہے۔کسی دوسری زبان کے الفاظ اور لسانی تشکیلات میں پوشیدہ مفاہیم اور تجربے تک پہنچنا اور پھر اس کی روح کو زندہ رکھتے ہوئے اسے دوسری زبان کے پیکر میں ڈھالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے ۔اس لیے ماہرین کا خیال ہے کہ کسی زبان میں ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اصل عبارت کے حسن اور اثر پذیری کو نہیں پہنچ سکتا۔

ادبی ترجموں کی افادیت میں ترجمے کی نوعیت اور اس کے معیار کا بڑا دخل ہوتا ہے اور اس کا تمام تر انحصار مترجم کی ذہنی وفکری صلاحیت نیز علمی و ادبی استعداد پر ہوتا ہے۔اس لیے ترجمہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر دسترس رکھتا ہو۔اصل تصنیف کی زبان،اس کے ادب اور اس کی قومی تہذیب سے پوری طرح واقف ہو۔مترجم کو اسی بنا پر دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام بھی دیا گیا ہے۔مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسری زبان میں پیش کردہ خیالات سے واقف ہو نیز الفاظ،تراکیب اور اصطلاحیں وضع کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔مترجم کو دونوں زبانوں کے ادبی سرمائے اور اس کے مخصوص مزاج سے کما حقہ واقفیت ہونی چاہئے۔اس میں ادبی قدروں کا ادراک بھی ہونا چاہئیے اور ان تمام مسائل پر بھی اس کی نظر ہونی چاہئیے جو ادب میں رونما ہوئے ہیں۔ادب کے سماجی، ثقافتی اور عمرانی رشتوں کا شعور بھی ایک مترجم کے لیے نہایت ضروری ہے ۔اگر کوئی مترجم ادب کی قدروں اور ادب و زندگی کے گہرے رشتوں سے ناواقف ہے تو وہ اس ادب کی زیریں سطح کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے اور نہ ہی وہ اس ادب کی اصل روح تک رسائی حاصل کر سکے گا۔اس لیے ایک اچھے ترجمہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ،محاورے اور تراکیب پر اپنی گہری نظر رکھے۔اس

کے علاوہ دونوں ادب کے مخصوص مزاج اور اس کے مظہر کو بھی ملحوظ رکھے۔ایک کامیاب ترجمہ نگار ترجمہ کے عمل سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی تخلیقی مراحل سے بھی گزرتا ہے۔ترجمہ کے عمل میں وہ مصنف کے مطمحِ نظر کو واضح کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے، جو تراکیب وضع کرتا ہے، جو پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے، وہ اصل تخلیق کے مطابق ہوتے ہوئے بھی انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور مترجم کی خلاّقانہ کاوش پر دلالت کرتا ہے۔ ترجمہ نگار مصنف کی بات یا خیال کو ایک نئے انداز اور نئے اسلوب میں پیش کر کے گویا اپنی ایک انفرادی شان پیدا کرتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترجمہ نگار کو بیک وقت دوہری ذمہ داری سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ دوہری ذمہ داری اس سے ادب کی زبان پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ ترجمہ کی زبان پر وسیع مہارت حاصل کرنے کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ان تمام شرائط سے بڑھ کر جو سب سے اہم شرط ہے وہ ترجمہ نگار کی دلچسپی، اس کا شوق وانہماک ہے۔اگر یہ نہیں ہے تو دوسری تمام شرطیں کامیاب ترجمہ کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ایک کامیاب مترجم کے لیے جن باتوں کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہیں:

۱۔کامیاب مترجم وہی ہے جو غیر زبان کے شاعر اور ترجمے کے قاری کے مابین براہ راست تعلق پیدا کردے اور ترجمہ کو پڑھتے وقت قاری کو مترجم کا وجود نہ کھٹکے۔

۲۔کامیاب ترجمہ وہی ہے جو مفہوم اور تاثیر کے لحاظ سے اصل سے قریب تر ہو۔اگر ترجمہ مفہوم اور تاثیر میں اصل سے آگے بڑھ جاتا ہے تو یہ ترجمہ کی خامی ہوگی اور پیچھے رہ جانا بھی خامی ہے اور ہو بہو ہونا انتہائی مشکل ہے۔

۳۔ترجمہ کا ہر قاری کچھ نئے پن کا متلاشی ہوتا ہے اور ہر لمحہ وہ چاہتا ہے کہ یہ مال 'درآمد' کیا ہوا ہے۔اس کا احساس اسے ہوتا رہے لہذا ہر ترجمے میں مفہوم اور تاثیر میں ایک لطیف سی اجنبیت کا ہونا لازمی ہے۔

۴۔اگر کسی ایک ہی شاعر کی کئی نظموں کا ترجمہ کرنا ہو تو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے کلام سے مخصوص اندازِ فکر کی نظموں کا ترجمہ کرے تاکہ اس کی انفرادیت ترجموں میں بھی متحرک دکھائی دے۔

۵۔شعری اصناف کا تعلق احساس سے ہوتا ہے اور اس کی تاثیر کا زیادہ تر انحصار وقتی ذہنی رجحان اور ماحول پر ہوتا ہے۔ ایک ہی شعر ایک خاص ذہنی کیفیت اور ماحول میں جتنا متاثر کرتا ہے اگر کسی دوسرے ماحول میں پڑھا جائے تو اس کی تاثیر کی شدت میں زبردست فرق پڑھ جاتا ہے ۔اس لیے ایک ہی شعر کا الگ الگ ماحول اور کیفیت میں الگ الگ مفہوم نکالا جا سکتا ہے۔مترجم کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ کس مفہوم کا ترجمہ کرے کہ قاری اس سے محظوظ ہو سکے۔اس سلسلے میں مترجم کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ ترجمہ کئے جانے والے شاعر کے الفاظ سے اپنے ترجمے کو قریب رکھے اور اصل متن سے جو مفہوم نکلتا ہو قریب قریب وہی مفہوم اپنے ترجمے کے الفاظ سے بھی ظاہر کرے۔

اردو زبان میں ترجمے کا آغاز وارتقاء کے بارے میں وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ اردو زبان میں کس ادبی زبان کا ترجمہ پہلے پہل کیا گیا۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کو سنجیدہ مطالعہ اور علمی تحقیق کے قابل کبھی سمجھا ہی نہیں گیا۔اب تک کی دریافتوں کے مطابق اردو زبان میں جو ترجمے ملتے ہیں ان کی نوعیت بھی جدا جدا ہیں۔بعض مذہبی نوعیت کی ہیں، بعض ادبی نوعیت کی اور بعض سائنسی علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں ادبی تراجم کا تذکرہ مقصود ہے اس لیے انہیں ترجموں کا ذکر کیا جائے گا جن کا تعلق کسی نہ کسی اعتبار سے ادب سے ہے۔ابتدا میں اردو ترجمے عربی اور فارسی زبان سے ہوئے۔اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک منظوم دوسرا منثور۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ پہلے نظم میں ترجمہ ہوا یا نثر میں۔ بہرحال ملاّ وجہی (متوفی ۱۶۵۶-۷۱ء) جو قطب شاہی عہد کا شاعر اور نثر نگار تھا، اس نے فتاحی نیشاپوری کے فارسی قصّہ 'حسن ودل' کا اردو ترجمہ 'سب رس' کے نام سے کیا تھا۔ ملاّ وجہی کا ہی ایک معاصر شاعر غواصی تھا جس نے عربی کے مشہور ومعروف قصّہ 'الف لیلیٰ' کا منظوم ترجمہ 'سیف الملوک وبدیع الجمال' کے نام سے کیا۔ان کی ایک اور مثنوی 'مینا ستونتی' ہے۔ غالباً یہ بھی کسی سنسکرت قصہ سے ماخوذ ہے۔اسی دور کا ایک اور شاعر ابن نشاطی تھا جس نے مثنوی 'پھول بن' لکھی۔اس مثنوی کو ایک فارسی قصہ 'بساتین الانس' سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

اسی دور میں غلام علی نے فارسی سے 'پدماوت' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بھی عربی، فارسی اور سنسکرت کے قصّے اردو میں ادبی ترجمے کے مرکز بنتے رہے۔ 'الف لیلیٰ' عربی زبان کی داستان تھی جو فارسی کے توسط سے اردو میں آئی۔ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، گل بکاؤلی وغیرہ اپنی اصل کے اعتبار سے سنسکرت کی ہی داستانیں ہیں جو اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسمِ ہوش ربا، چہار درویش وغیرہ اپنی اصل کے اعتبار سے فارسی کی داستانیں ہیں جو اردو میں منتقل ہوئیں۔ اسی طرح ۵۹-۱۷۳۲ء کے درمیان عیسوی خاں نے ملاّ واعظ کاشفی کے 'اخلاقِ محسنی' کو 'قصہ مہر افروز ودلبر' کے نام سے ترجمہ کیا۔ محمد حسین عطا خاں تحسین نے ۷۵-۱۷۶۸ء کے درمیان فارسی قصہ 'چہار درویش' کا اردو ترجمہ 'نوطرزِ مرصع' کے نام سے کیا۔ اسی زمانے میں ملاّ حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف 'روضۃ الشہدا' کا اردو ترجمہ فضل علی فضلی نے 'کربل کتھا' کے نام سے کیا۔ گو ترجمہ نگاری کے اس فن کو اُس وقت ایک نئی جہت ملی جب ہندوستان میں انگریزوں کی آمد ہوئی۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب انجمن شلز کا 'انجیلِ مقدس' ہے جس کی اشاعت ۱۷۴۸ء میں ہوئی تھی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی زبان سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام جب ۱۸۰۰ء میں ہوا تو تراجم کے منظّم سلسلے بھی شروع ہوئے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کالج نے انگریزی کی کسی کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں نہیں کیا بلکہ ان کے پیش نظر عربی، فارسی اور سنسکرت زبانیں رہیں اور اردو میں انہی زبانوں کی معروف کتابوں کو ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جاتا رہا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس کالج نے زیادہ تر علومِ مفیدہ کو ہی اپنے مقصد کا حاصل سمجھا اور انہی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ کہانی اور شاعری جن کا تعلق خالص ادب سے ہے ان پر بہت کم توجہ دی گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فورٹ ولیم کالج نے اردو کے تخلیقی ادب میں تصنیف وتالیف کا کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے کالج کے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ تر کلاسیکی زبانوں کی مشہور اور معروف کتابوں کو ہی اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ گلکرسٹ نے پہلے پہل اردو نثر کا ادب پیدا کیا۔ گلکرسٹ سے پہلے اردو نثر کی باقاعدہ روایت موجود نہیں تھی۔ بلاشبہ کچھ تراجم بکھری ہوئی صورت میں ضرور ملتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر میں زبان غرابت کا شکار ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے کارناموں میں لفظی تراجم پر زور نہیں دیا گیا بلکہ مفہوم کو اردو کا جامہ پہنانے کی سعی کی گئی۔ چنانچہ مترجمین متبادل الفاظ کے انتخاب میں نہ صرف آزاد رہے بلکہ تخلیقی تسلسل کو برقرار رکھنے اور قصے کو ہندوستانی معاشرت کا نمائندہ بنانے کے لیے روزمرہ کو ملحوظِ نظر رکھنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن کی باغ وبہار، حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی، نہال چند لاہوری کی مذہبِ عشق وغیرہ کے تراجم میں زبان لڑکھڑانے کے بجائے رواں دواں نظر آتی ہے۔

ترجمے کی روایت کو ایک نئے موڑ سے آشنا کرانے میں دلی کالج (۱۸۲۵ء) نے بھی نمایاں کام انجام دیا۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی' قائم کی گئی اور جدید کتابوں کی تالیف وترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کرنے پر زور دیا اور آزاد ترجمے کو ترجیح دی۔ فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں یہاں زیادہ وسیع پیمانے پر ترجمے کے کام انجام دئے گئے لیکن یہاں بھی ادبی کتابوں کے تراجم دوسرے علوم کے تراجم کے مقابلے بہت کم ہوئے۔ دلی کالج کے چند معروف ادبی تراجم میں امام بخش صہبائی کا ترجمہ 'حدائق البلاغت' ماسٹر پیارے لال کا ترجمہ 'دربارِ قیصری' اور ان کے علاوہ دیگر ادبا کے تراجم قصہ چہار درویش، کلیلہ ودمنہ، شکنتلا، بدرِ منیر وغیرہ اہم ہیں۔ سید اعظم علی اکبر آبادی جو مرزا غالب کے دوستوں میں سے تھے، نے بھی 'سکندر نامہ' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اسی زمانے میں خواجہ امان نے 'بوستانِ خیال' کے نام سے میر تقی خیال کی فارسی داستان کی دس جلدوں میں سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ اردو میں انگریزی کی منتخب نظموں کا پہلا ترجمہ 'جواہرِ منظوم' کے نام سے قلق میرٹھی نے اسی زمانے میں کیا۔ اسی زمانے میں گارساں دتاسی کے خطبات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

ترجمے کی اس روایت میں سرسید کی تحریک کو بھی بڑا دخل ہے۔ سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی نے ترجمے کی اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن سیاسی اختلافات کے سبب ادبی تراجم کے اعلیٰ نمونے نہیں پیش کر سکی۔ چند ادبی تراجم جنہیں قبولِ عام حاصل ہوا ان میں عنایت اللہ دہلوی کے تراجم ہیں۔ انہوں نے انگریزی ادب کی دقیق کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، اناطولے فرانس کی تائیس، فلابیر کی سلامبو، کپلنگ کی جنگل بک اور شیکسپیئر کے ڈرامے شامل ہیں۔

۱۸۶۵ء میں جب انجمن پنجاب لاہور کا قیام عمل میں آیا تو اس کے تحت بھی ترجمے کے عمل کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہاں بھی ادبی کتب میں زیادہ دلچسپی نہیں لی گئی اور سائنسی کتب کے ترجمہ پر زور دیا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں ہی روہیل کھنڈ میں ایک لٹریری سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔

اس سوسائٹی میں بھی علمی اور مغربی علوم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا لیکن ادبی کتب کے ترجمے پر اس سوسائٹی نے بھی توجہ نہیں دی۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے تحت بھی ترجمے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کے قیام سے اردو ترجمے کی روایت کو ایک نئی جہت ملی یہاں ادبی تراجم کے ساتھ ساتھ وضع اصطلاحات پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ تاریخ ادبیاتِ ایران، خطباتِ گارساں دتاسی، تاریخ عہد انگلشیہ، مشاہیر یونان وروم وغیرہ اس انجمن کے یادگار تراجم ہیں۔ اردو میں ترجمے کی اس روایت کو منظّم بنانے میں جامعہ عثمانیہ کا خاصہ اہم کردار رہا ہے۔ ا س کا قیام ۱۹۱۸ء میں عمل میں آیا اور یہاں تقریباً ۵۰۰ کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں سائنسی کتب کے علاوہ ادبی اور نصابی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے۔

۱۹۳۶ء کے بعد اردو ادب میں ادبی اور تنقیدی تراجم میں اضافہ ہوا۔ مغربی تنقیدی کتابوں کے بہت سے ترجمے اردو زبان میں پیش کئے گئے۔ عزیز احمد نے ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ 'فن شاعری' کے نام سے کیا جس کو انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں محمد ہادی حسن نے مغرب کی ایک تنقیدی کتاب کا ترجمہ 'مغربی شعریات' کے نام سے کیا۔ ارسطو کی کتاب بوطیقا کا ترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی 'ترجمہ' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں کیا۔ ۱۹۷۶ میں جمیل جالبی کی ترجمہ شدہ کتاب 'ارسطو سے ایلیٹ تک' شائع ہوئی۔ 'ایلیٹ کے مضامین' کے نام سے جمیل جالبی نے ایلیٹ کے انگریزی مضامین کو اردو میں منتقل کیا جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں ہڈسن ولیم ہنری کی ادبی کتاب کا ترجمہ عصمت جاوید نے کیا جو اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس دور میں ترجمے کی رَو پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہوگئی۔ نیاز فتح پوری نے گیتا نجلی کا ترجمہ 'عرضِ نغمہ' کے نام سے کیا۔ سجاد حیدر یلدرم اور حامد اللہ افسر کے چند ترجمہ شدہ افسانے شائع ہوئے۔ جلیل قدوائی، صادق الخیری، منصور احمد، حامد علی خان، محمد مجیب، فضل حق قریشی، خواجہ مہدی علی خان وغیرہ نے مغربی افسانوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کی اہم ذمہ داری نبھائی۔ ل۔ احمد نے فرانسیسی ادیبہ کی خودنوشت 'کیسانونا' کو 'نئی صبح' کے نام سے ترجمہ کیا۔ گوپی ناتھ امن ۱۹۶۱ء میں راجندر پرساد کی خودنوشت کو اردو میں 'اپنی کہانی' کے نام سے ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ محمد علی صدیقی نے 'کروچے کی سرگزشت' اور اختر حسین رائے پوری نے 'گورکی کی آپ بیتی' کے نام سے ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جن کا ذکر اس ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔

مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم جس پیمانے پر اردو میں ہوئے اس سے اردو ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوگیا۔ ۱۹ویں صدی نصف سے جو مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم سامنے آنے شروع ہوئے تو یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ

> ''۔۔۔کم و بیش ۱۹۳۰ء تک اردو شعرو ادب وکٹورین عہد کے انگریزی ادب کے سائے تلے پلتا اور لگ بھگ اسی سانچے میں ڈھلتا رہا۔'' (مقدمہ ترجمہ کا فن اور ترجمہ کی روایت از قمر رئیس)

۱۹۳۰ء کے بعد دوسری زبانوں سے ترجمے شروع ہوئے اور اس دور کے تقریباً تمام ادیبوں نے فرانسیسی، روسی، ترکی، اطالوی، چینی اور امریکی ادب کے شاہکاروں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں ترجمہ بطور فن اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ مشرق ومغرب کی بیشتر زبانوں کے تراجم آج ہمارے ادب میں موجود ہیں لیکن اس کا ایک کمزور پہلو بھی ہے۔ ہمارے یہاں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی اپنی ایک تاریخ و تہذیب اور اپنا ایک ادب ہے۔ ان علاقائی زبانوں کے ادبیات کے ترجم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے اور میرے خیال میں اس عمل کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم دیگر ممالک کی تہذیب اور ان کے ادبیات سے جس قدر واقف ہیں اپنے ملک کے دوسرے علاقوں کی تہذیب اور ادبیات سے واقف نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں بعض کوششیں کی گئی ہیں مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی اور دیگر اداروں نے کچھ علاقائی ادب کے تراجم شائع کئے ہیں۔ بعض تراجم انفرادی کوشش کے نتیجے میں بھی سامنے آئے ہیں لیکن یہ ناکافی ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی مزید پیش رفت کی ضرورت ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ترجمے میں معیار کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اچھے اور معیاری ترجمے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ترجمہ نگاری کے معیار پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کی تخلیقات میں تیزی آجانے کے سبب ترجمہ نگاری کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ چند رسائل میں بھی کچھ ترجمے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ موجودہ چند برسوں میں ترجمے کا جو اہم کام منظرِ عام پر آیا ہے ان میں ڈاکٹر ارجمند آرا کی 'جوینده پاینده' ہے جو رالف رسل کی آپ بیتی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ارشاد نیازی نے پنڈت نارائن شرما کی کتاب 'ہتوپدیش' کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے راجندر یادو کی منتخب ہندی کہانیوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے جو حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئی ہے۔

☆☆☆

عزیر اسرائیل
شعبۂ اردو
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

اردو اخبارات
ایک قدم آگے، دو قدم پیچھے

Urdu Akhbaraat: ek qadam aage do qadam peeche by Uzair Israeel,University of Delhi, Delhi.
Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 27-29.

جدید ٹکنالوجی کا فائدہ جہاں دوسری زبانوں نے اٹھایا وہیں اردو زبان کو بھی اس کا فائدہ پہنچا۔ کمپیوٹر کی کتابت اور پریس کی سہولیات سے ملک کے بیشتر مقامات سے اردو کے اخبارات کی اشاعت ہونے لگی۔ جہاں دہلی جیسے اردو مرکز سے دو یا تین اخبارت شائع ہوتے تھے وہیں اب درجنوں اخبارات شائع ہورہے ہیں۔ جس طرح ٹیلی ویزن کی دنیا میں صرف دوردرشن ہی کا درشن ہوتا تھا اسی طرح اردو میں قومی آواز کا نام تھا۔ اس کے بعد کئی چھوٹے بڑے اخبارات شائع ہوئے لیکن قومی آواز کا مقابلہ کوئی اخبار نہیں کرسکا۔ اردو صحافت میں حقیقی معنوں میں انقلاب اس وقت آیا جب سہارا نے اپنے بینر تلے اردو میں ایک روزنامہ راسٹریہ سہارا جاری کیا۔ اس اخبار نے دیکھتے دیکھتے پوری ملک سے اپنے ایڈیشن نکالنا شروع کردیا۔ اردو کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ اس کی ریڈرشپ نہ کے برابر ہے اس اخبار کی بدولت اردو ریڈرشپ لاکھوں میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد دہلی سے ہی ہندوستان ایکسپریس اور ہمارا سماج کا اجرا عمل میں آیا۔ روزنامہ صحافت اگرچہ پہلے سے شائع ہورہا تھا لیکن اپنے معیار میں بہتری پیدا کرکے راسٹریہ سہارا کو ٹکر دینے لگا۔ اس بیچ روزنامہ سیاسی تقدیر بھی پورے آب وتاب کے ساتھ جاری ہوا اور بہت ہی کم وقت میں اس نے اپنی پہچان بنالی۔ دوسرے اخبارات جیسے جدید میل، جدید خبر وغیرہ بھی موقع موقع پر اپنی بہار دکھا کر مارکیٹ سے غائب ہوتے رہے۔ اردو صحافت کی دنیا میں دوسرا بڑا انقلاب اس وقت برپا ہوا جب جاگرن گروپ نے ممبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کو خرید لیا۔ جاگرن گروپ نے اس اخبار کو ممبئی کے علاوہ دہلی سے بھی شائع کیا۔ اس اخبار کے آنے سے روزنامہ سہارا کی بادشاہت ختم ہوگئی۔ اب روزنامہ سہارا اور روزنامہ انقلاب کے علاوہ دوسرے اخبارات بھی اپنی موجودگی کا برابر احساس دلاتے رہتے ہیں۔

نئے زمانے اور نئی ٹکنالوجی کے آنے سے اخبارات کا معیار رنگ وروغن کے اعتبار سے اگرچہ بڑھا ہے لیکن مواد اور پیشکش کے اعتبار سے کئی معنوں میں گراوٹ آئی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً آج کی بھاگ دوڑ کی زندگی میں ہر کام جلد سے جلد نپٹانے کی وجہ سے کسی کو زبان وبیان کی غلطیوں پر دھیان دینے کی فرصت کہاں ہے۔ اب مولانا آزاد جیسے لوگ رہے نہیں جو صحافت کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ پہلے ہر اخبار میں کاتب اور سب ایڈیٹر الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ کمپیوٹر آنے کے بعد بھی یہ روایت برقرار رہی۔ لیکن روزنامہ انقلاب نے اس روایت کو تبدیل کردیا۔ اس نے اپنے اخبار کے لیے جن لوگوں کا تقرر کیا ان کو کمپوزر کے ساتھ سب ایڈیٹنگ کی بھی ذمہ داری بھی دی۔ یہ لوگ کہیں آسمان سے تو نہیں آئے۔ دوسرے اخبارات میں کمپیوٹر آپریٹر کی حیثیت سے کام کرنے والے یہاں پر آکر کمپیوٹر آپریٹر کے ساتھ سب ایڈیٹر بھی ہوگئے دو آدمیوں کا کام کرکے تھوڑی سی زیادہ تنخواہ پر تقرری پاکر کمپیوٹر آپریٹر خوش ہوگئے۔ بیچارے وہ لوگ جو ماہر سب ایڈیٹر تھے ان کا

کوئی پرسان حال نہیں رہا کیوں کہ ان کو کمپیوٹر چلانا نہیں آتا تھا۔ دوسرے اخبار والوں نے دیکھا کہ دو آدمیوں کا کام ایک سے ہوسکتا ہے تو انہیں نے بھی اسی فارمولے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ اب اخبارات میں زبان و بیان کی غلطی کو غلطی ماننے کا تصور ہی ختم ہوتا جارہا ہے۔

اخبارات کے معیار میں گراوٹ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات میں پیشہ وروں کی بے حد کمی ہے۔ کمی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اردو میں پیشہ ور صحافی نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب کم دام میں کام کرنے والے آسانی سے دستیاب ہو جائیں تو پھر کیا پڑی ہے کہ اس کے لیے زیادہ روپیے خرچ کیے جائیں۔ اخبارات کی آفسوں میں اس وقت زیادہ تر طلبہ کام کرتے ہیں۔ چونکہ اخبارات کی آفسوں میں شام کے وقت کام ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی پڑھائی متاثر نہیں ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر وہ طلبہ ہوتے ہیں جو صحافت میں صرف جیب خرچ کے لیے جاتے ہی۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھائی مکمل ہوتے ہی ان کی صحافت کی نوکری بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ صحافت کو بطور پیشہ اپنانے والے اردو میں بہت کم ہیں۔ جب تک پیشہ ور صحافی اردو میں نہیں ہونگے اردو صحافت کا معیار نہیں بلند ہوگا۔

آج کل اردو اخبارات میں جس قسم کی لاپروہیاں زبان و بیان اور صحافتی اصولوں کے ساتھ کی جارہی ہے اس کے بارے میں بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ عموماً لوگ ان غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر صحافت کا معیار بلند کرنا ہے تو ان غلطیوں کو سدھارنا ہوگا۔

زبان و بیان کی غلطی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اردو اخبارات اردو مترجم نہیں رکھتے۔ ہندی زبان کی ویب سائٹوں پر موجود مواد کو کاپی کر کے گوگل یا کسی اور ذریعہ سے ترجمہ کر کے اس کو شائع کر دیتے ہیں۔ انسانی ترجمہ کا بدل مشینی ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اگر مشینی ترجمہ اتنا ہی کامیاب ہوتا تو کمپنیاں لاکھوں روپیہ دے کر مترجم نہیں رکھ رہی ہوتیں۔

پروف کی غلطیاں:

انگریزی کا مؤقر روزنامہ 'ہندو' کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے شماروں میں زبان و بیان کی غلطیوں کی قارئین نشاندہی کرتے ہیں اور اخبار باقاعدہ ان کو شائع کرتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اس قسم کا کوئی تنقیدی شعور نہیں ہے جس کی وجہ سے اخبارات میں تقریبا ہر دوسری سطر میں پروف کی غلطی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ یہ لاپرواہی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ شہ سرخی بھی اس کی نذر ہو جاتی ہے۔ پروف کی غلطیاں کس قدر خطرناک حد ہوتی ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے دہلی کے حضرت نظام الدین سے شائع ہونے والے ایک موقر روزنامہ میں دیکھا کہ اس نے آخری صفحہ پر دو تصویریں شائع کیا۔ ایک میں وزیر اعلی شیلا دکشت اپنے محافظوں کے ساتھ اسمبلی ہاؤس کی طرف جارہی رہی تھی دوسری تصویر میں ایک ملزم کو پولیس عدالت میں پیشی کے لیے لے جارہی تھی۔ اخبار کی لاپرواہی سے دونوں کا کیپشن تبدیل ہو گیا۔ قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ مفہوم کس قدر بدل گیا۔ تعجب کی بات یہ کہ دوسرے دن اخبار میں اس کے لیے کوئی معذرت بھی نہیں شائع ہوئی کہ 'جانے دیں، پڑھتا ہی کون ہے؟' دہلی سے شائع ہونے والے بہت سارے اخبارات شاید اسی وجہ سے آنکھ بند کر کے اخبار شائع کرتے ہیں کہ 'پڑھتا ہی کون ہے'۔

اگر آج ہی کے اخبارات کے صفحۂ اول سے پروف کی غلطیاں گنانا شروع کر دوں تو ہوسکتا ہے کہ یہ مضمون کافی طویل ہو جائے اس وجہ سے دوسری لاپرواہیوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

صحافتی زبان سے لاعلمی:

اردو اخبارات میں عموماً صحافتی زبان کی ایسی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں کہ حساس قاری دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ نیوز کیا ہے؟ ویوز کیا ہے؟ اس میں کم ہی کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ ایک ماہر اخبار نویس کا کمال یہ ہے کہ وہ سمجھے کہ کہاں خبر ختم ہو رہی ہے اور کہاں سے تبصرہ شروع ہو رہا ہے۔ اخبارات کے صفحات میں ادارتی صفحہ ہی تبصروں کے لیے ہوتا ہے۔ افسوس کی بات یہ کہ اس جگہ تبصرہ کے بجائے خبر ہوتی ہے فرق یہ ہوتا ہے کہ خبر کے ہاتھ پاؤں کو توڑ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مضمون کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے کچھ سالوں پہلے یہ سلسلہ شروع کیا تھا کہ وہ اہم خبروں پر آخر میں دو یا تین جملوں میں اپنی رائے بھی دے گا۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ رہا۔ لیکن قارئین کو یہ روش پسند نہیں آئی اور اخبار کو یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ خبر معصوم ہوتی ہے۔ اس کی معصومیت کو تبصروں کے ذریعہ ختم نہ کریں۔

صحافیانہ دیانت داری کی کمی:

ہمارے یہاں صحافیانہ دیانت داری کی بھی بڑی کمی ہے۔ چونکہ اردو اخبارات عموماً افرادی قلت کا شکار ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر جگہ ان کا نمائندہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے خبریں عموماً مختلف ایجنسیوں سے لیتے ہیں یا انٹرنیٹ سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم مآخذ ہوتا ہے پریس ریلیز کا۔ دیانت داری کا تقاضا ہے کہ جہاں سے خبر لی جائے وہاں کا حوالہ دے دیا جائے۔ پریس ریلیز کو پریس ریلیز کے نام سے ہی شائع کیا جائے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی پریس ریلیز کو مختلف اخبارات اپنے اخبار کی نیوز سروس کی بازیافت قرار دینے کی ناروا کوشش کرتے ہیں۔ قاری سب دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ حیرت کی بات یہ کہ

مختلف اخبارات میں ایک ہی خبر انہیں الفاظ اور سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہے لیکن ہر ایک کا سورس الگ ہے۔ یہ معجزہ اردو ہی میں ہوسکتا ہے۔

ہمارے بہت سارے اخبارات اپنے ادارتی صفحہ کا پیٹ بھرنے کے لیے پاکستان کے اخبارات کی ویب سائٹوں سے کاپی پیسٹ کرلیتے ہیں۔ اس عمل میں انہیں یہ سہولت محسوس ہوتی ہے کہ انہیں ٹائپ کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ حقیقت میں یہ ایک خطرناک کام ہے۔ سرحد کے دونوں طرف علمی تبادلہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن اخبار کا صفحہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اس میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ہندو پاک کے تعلقات اکثر کشیدہ رہتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو سرحد کے دونوں طرف الگ نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے۔ پریس ایکٹ کے تحت اخبارات کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ خبریں لکھتے وقت ملکی حالات اور مفادات کا خیال رکھیں گے۔ بعض دفعہ پاکستان کے کالم نگار اپنی تحریروں میں ہندوستان کے موقف کے خلاف باتیں پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اصطلاحات کی الٹ پھیر بھی جداگانہ معنی پیدا کردیتی ہے۔ مثلاً پاکستان میں ہندستان کے زیر انتظام کشمیر کو مقبوضہ کشمیر کہا جاتا ہے اور پاکستان مقبوضہ کشمیر کو آزاد کشمیر کہا جاسکتا ہے۔ اگر ان اصطلاحوں کو ہندوستان میں کوئی اخبار استعمال کرتا ہے تو اس کا مواخذہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو والوں پر ہمیشہ پاکستان کے لیے سافٹ کارنر ہونے کا الزام لگتا رہا ہے۔ اگر کوئی اردو کا خیر خواہ پورے ایک ماہ میں اردو اخبارات میں پاکستانی اخبارات سے لیے گیے مضامین کی فہرست سیکورٹی ایجنسیوں کو فراہم کردے تو مسلمانوں کے ساتھ اردو اخبارات بھی مشکوک ہوجائیں گے۔

اردو اخبارات کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ ہائے تو بہ زیادہ مچاتے ہیں۔ اردو اخبارات پڑھتے ہوئے بعض دفعہ واقعی اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ کسی بھی اخبار کی کامیابی یہ ہے کہ اس کو پڑھنے والا محسوس نہ کرسکے کہ اخبار کس کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ اخبار کا کام خبریں دینا ہے۔ اس پر رائے دینا یا کوئی مشورہ دینا اس کا کام نہیں۔ ہاں اس کے لیے بھی اخبار میں متعین جگہ ہوتی ہے۔ جس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اردو اخبارات کا عام قاری مسلمان ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اردو اخبارات عموماً مسلمانوں کی حمایت میں خبریں شائع کرتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ اس روش پر وہی اخبارات نہیں عمل کرتے جن کے مالکان مسلمان ہیں۔ کارپوریٹ گھرانوں سے شائع ہونے والے اخبارات جن کے مالکان مسلمان نہیں ہیں وہ بھی مجبوری کی وجہ سے اس روش پر قائم ہیں۔ دینک جاگرن اور انقلاب، راسٹریہ سہارا اردو اور ہندی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک مودی کو ہیرو کے طور پر پیش کررہا ہے تو دوسرے کو وہی مودی ولن نظر آتا ہے۔ یہ انتہا پسندانہ رویہ ہے جو قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

> اردو اخبارات میں پیشہ وروں کی بے حد کمی ہے۔ کمی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اردو میں پیشہ ور صحافی نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب کم دام میں کام کرنے والے آسانی سے دستیاب ہوجائیں تو پھر کیا پڑی ہے کہ اس کے لیے زیادہ روپیے خرچ کیے جائیں۔ اخبارات کی آفسوں میں اس وقت زیادہ تر طلبہ کام کرتے ہیں۔ چونکہ اخبارات کی آفسوں میں شام کے وقت کام ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی پڑھائی متاثر نہیں ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر وہ طلبہ ہوتے ہیں جو صحافت میں صرف جیب خرچ کے لیے جاتے ہی۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھائی مکمل ہوتے ہی ان کی صحافت کی نوکری بھی مکمل ہوجاتی ہے۔ صحافت کو بطور پیشہ اپنانے والے اردو میں بہت کم ہیں۔ جب تک پیشہ ور صحافی اردو میں نہیں ہونگے اردو صحافت کا معیار نہیں بلند ہوگا۔

ہم نے اس مضمون میں صرف دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات کی بات کی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ دوسری جگہوں سے شائع ہونے والے اخبارات ان کوتاہیوں سے پاک ہیں۔ ان کو بھی اسی زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس جگہ پر مختلف اخبارات سے مثالیں بھی دی جاسکتی تھیں۔ لیکن ان سے درگزر کیا جارہا ہے صرف اس لیے کہ خداوندان صحافت کی شان میں مزید گستاخی سے معاملہ خراب ہوسکتا ہے۔

احمد علی جوہر
ریسرچ اسکالر
جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، دہلی

انسانیت کا نوحہ گر افسانہ نگار
اقبال متین

Insaaniyat ka nauhaa gar afsana nigaar: Iqbal mateen by Ahmad Ali jauhar, research scholar, JNU, Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 30-32.

آزادی کے بعد جب ہم اردو افسانہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال متین ہمیں ایک اہم اور ممتاز افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر اہل علم وادب سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''نچا ہوا البم'' کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں سامنے آیا۔ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''خالی پٹاریوں کا مداری'' (۱۹۷۷ء) ''آگہی کے ویرانے'' (۱۹۸۰ء) ''مزبلہ'' (۱۹۸۹ء) ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' (۱۹۹۳ء) اور ''شہر آشوب'' (۲۰۰۳ء) ہیں۔

اقبال متین کی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' ۱۹۴۵ء میں 'ادب لطیف' میں شائع ہوئی اور ان کا آخری افسانوی مجموعہ ''شہر آشوب'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان کا افسانوی سفر تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں اقبال متین نے اپنی افسانوی تحریروں سے افسانوی ادب کو مالا مال کیا اور بہت سی ایسی خوبصورت اور شاہکار کہانیاں لکھیں جن سے دنیائے افسانہ میں ان کی اپنی منفرد و مستحکم شناخت قائم ہوئی اور وہ ایک اچھے اور باکمال افسانہ نگار تسلیم کیے گئے۔

اقبال متین کی کہانیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں اور زندگی کے مختلف رُخوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کئی زاویوں سے سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں انسانیت کے دکھ درد میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بقول عابد سہیل:

> ''ان کے افسانوں میں دکھوں کی پھوار جس طرح برستی ہے ویسے اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کی تحریروں میں شاید ہی برسی ہو۔ لیکن یہ پھوار ان کو، ان کے کرداروں کو اور ان افسانوں کے قاری کو جینے اور زندگی کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔''(۱)

اقبال متین کی ذاتی زندگی انتہائی دُکھ بھری تھی۔ اپنے نجی غم میں انھوں نے دنیا کے غموں اور دکھوں کو شامل کر کے جب کہانیاں لکھنی شروع کیں تو ان کی کہانیوں میں دکھ درد کے مارے تمام انسانوں کو اپنی کہانی نظر آنے لگی۔ ان کی کہانیوں کی یہی وہ خوبی ہے جو انھیں مقبول ومحبوب اور ایک قابل قدر افسانہ نگار کی شکل میں سامنے لاتی ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس قوی ہوتا ہے کہ وہ انسانیت اور اخلاقی قدروں کے زوال کے نوحہ گر ہیں۔ دراصل اقبال متین کو انسانیت اور انسانی قدریں بے حد عزیز ہیں مگر بدلتے اور بگڑتے معاشرے میں جب وہ انسانیت کا جنازہ نکلتے دیکھتے ہیں تو وہ درد سے تلملا اُٹھتے ہیں اور کراہنے لگتے ہیں۔ یہی وہ دُکھ درد ہے جسے اقبال متین الفاظ کا جامہ پہنا کر افسانوی شکل عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں درد کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ دیکھئے درج ذیل اقتباس میں وہ انسانیت کے ملیامیٹ ہونے پر کس طرح ماتم کناں ہیں اور اس نوحہ وغم کو وہ کس طرح لفظوں میں ڈھالتے ہیں:

> ''اب تو ہر عید تہوار کو خوشیاں گھر گھر میں چھپ چھپ کر روتی ہیں۔ مسرتیں ہنسنا بھول گئی ہیں۔ فطرت جب اپنا سب کچھ لٹا چکتی ہے تو نہ شعائیں روشنی پھینکتی ہیں نہ کرنیں۔ بس ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں۔ ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں کہ سورج کا لاٹھیکرا بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہ کالا ٹھیکرا کب طلوع ہوتا ہے، کب غروب ہوتا ہے کسی کو پتہ نہیں۔ اب میرے شہر میں کوئی آدمی کسی آدمی کو نہیں پہچانتا۔ انسانیت جب پہچانی نہیں جاتی تو دلوں کی اجڑتی بستیوں کو کون

پہچانتا ہے۔آنکھوں میں بستے ویرانوں کوکون پہچانتا ہے۔اب تو نام پوچھ کرخنجر چلائے جاتے ہیں لیکن کٹتے ہیں تو سڑک پر بہتا ہوا لہو کچھ اس طرح ایک ہوجاتا ہے کہ اس خنجر سے لکیر کھینچ کر اس کو جدا نہیں کر سکتے جس خنجر سے وہ بہایا گیا تھا۔نام پوچھنے پر یہ خون اپنا نام بھی تو نہیں بتلاتا۔اور میں ایسے میں ہر ارتھی، ہر جنازے کے ساتھ اپنی منی کو دفناتا پھرتا ہوں جلاتا پھرتا ہوں۔''(۲)

اسی افسانے کے دوسرے اقتباس میں ملاحظہ کیجیے کہ افسانہ نگار نے فنکاری کے ساتھ انسانی درندگی کو کس طرح آشکارا کیا ہے:

''باہر لگے کرفیو میں زندگی اپنی حفاظت کے تصوّر کے باوجود کس درجہ بے آرام ہے۔ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے۔ چھپے ہوئے خنجروں نے جنہیں کاٹ دیا ہے۔تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔غذا مہنگی ہے خون ارزاں ہے، انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہوسکتا ہے لیکن گیہوں کے دانے کے لیے بچے بلک رہے ہیں۔''(۳)

اقبال متین نے اپنی کہانیوں میں طنز کے عنصر سے بہت کام لیا ہے۔ یہ عنصر ان کی تحریروں کے رگ وپے میں خون کی طرح جاری وساری ہے۔ دیکھئے انھوں نے اپنے ایک افسانے بعنوان ''چھت'' میں موجودہ تہذیب اور معاشرتی زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کتنا گہرا طنز کیا ہے:

''آج آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیاں شہروں کو لوٹ رہی ہیں۔ایک دوسرے سے کٹا پھٹا سڑکوں پر بے تحاشہ بھاگتا ہوا انسان شہروں کو لوٹ رہا ہے۔ دوڑتی ہوئی کاریں اڑتے ہوئے جہاز، بڑے بڑے سنیما گھروں کے پردوں پر اسمگلنگ کا کاروبار، قتل، غارت گری جو سارے معاشرے کا گھناؤنا پہلو ہے وہی آج سب سے دلچسپ پہلو ہے۔''(۴)

اقبال متین کی کہانیوں میں بے زمینی کا احساس شدید طور پر نمایاں ہے۔انھوں نے بے زمینی کے کرب کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے اور انتہائی فنکاری سے اُسے لفظوں کا پیرہن عطا کیا ہے۔ان کے یہاں بنیادی انسلاک کے فقدان سے پیدا کرب بے زمینی کے کرب کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیکھئے یہ بے زمینی ''نچا ہوا البم'' میں کس طریقے سے سامنے آئی ہے۔افسانہ کا کردار ''میں'' بچپن کی سرزمین کی بازیافت کے لیے سفر کرتا ہے اور دوبارہ اس ماحول میں سانس لینے کی کوشش کرتا ہے مگر۔

''یہ ہمارا مکان ہے۔میں مکان کے صدر دروازے تک آپہنچا ہوں صدر دروازہ جیسے صرف میرے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔میرا اشتیاق کس قدر بڑھ گیا ہے۔ مگر میں اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل ہورہا ہوں جیسے کسی دوسرے کے گھر اپنی کوئی سب سے زیادہ قیمتی شئے تلاش کررہا ہوں جو گم ہوگئی ہے۔درودیوار مجھے حسرت سے تک رہے ہیں یا میں انہیں حسرت سے تک رہا ہوں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔اتنا ضرور ہے کہ حسرتیں مشترک ہیں۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوں، یادوں کے اس جھرمٹ میں کسی کو نظروں سے گدگداتا ہوں۔کسی سے نظریں چراتا ہوں اور آگے بڑھتا بڑھتا آہستہ آہستہ اس دروازے تک آپہنچا ہوں جہاں سے مجھے اپنے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونا ہے۔لیکن دروازے پر قفل لگا ہے۔ میں تڑپ کر رہ گیا ہوں۔ جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے سینے سے جھپٹ لے۔کاش یہ دروازے ایک بار میرے لئے کھل سکتے۔''(۵)

''نچا ہوا البم'' میں بچپن کے ماحول سے دوری ایک کسک کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔یہی وہ کسک ہے جو افسانے کے کردار کو دو حصّوں یعنی حال اور ماضی کی شخصیت میں منقسم کردیتی ہے۔ان دونوں کے درمیان وقت کی خلیج ہے جسے وہ پُر کرنے سے معذور ہے۔اس طرح دونوں شخصیتیں ایک سطح پر آکر استعاراتی جہت اختیار کرلیتی ہیں اور ذات کی شکستگی بڑے نوکیلے انداز سے وقت کے پس منظر میں ظہور پذیر ہوتی ہے:

''میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے مجھے غور سے دیکھا.....کیا تم وہی ہو جس نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟۔کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟.....میں نے منہ پھیر لیا تو اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیئے۔ٹھیک ہے، آج سے میں بھی اسی کو ڈھونڈوں گا جس کی تمہیں تلاش ہے لیکن کیا اس تلاش میں ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟''(۶)

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں بے زمینی کے تجربے عجیب وغریب زاویوں سے کئے ہیں۔''کتاب سے کتبہ تک'' میں یہ بے زمینی منوّ رمیاں، کی غیر عملی زندگی کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔اپنی بڑھتی عمر کے

ساتھ منوّ رمیاں ذہنی طور پر عالم وفاضل تو بن گئے اور پڑھتے رہنا ان کا مشغلہ تو ہو گیا لیکن ان کی بے عمل زندگی جو جاگیردارانہ نظام کی پروردہ تھی گزرے ہوئے وقت کی صورت میں بے زمینی کا احساس بن کر کاٹنے لگی۔

''اور اب منوّ رمیاں کی سمجھ میں یہ بات آ چکی تھی کہ یہ سب کچھ انھوں نے کھو دیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو گیا کہ منوّ رمیاں بیچارے قبروں کے بیچوں بیچ کھڑے اپنی نکٹائی اور پتلون کی کریز درست کرتے رہ گئے۔''(۷)

اقبال متین کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اقبال متین کو اس بات کا شدید رنج وملال ہے کہ موجودہ متعفن معاشرے میں بے حسی و بے ضمیری عام ہو چکی ہے۔ لوگ اپنی انفرادی شناخت کھو چکے ہیں۔ انسانی اور اخلاقی اقدار بے معنی ہو چکی ہیں۔ بیشتر افراد ذاتی اور محدود مفادات کے چکر میں پڑ کر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ بظاہر تو انسان نے سائنس اور صنعت کی بدولت بڑی ترقی کر لی ہے مگر زندگی کی بنیادی قدر یعنی انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ جو چند افراد آج بھی اس قدر کو کسی نہ کسی وجہ سے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ عام انسانوں کا استحصال کرنے والے دولت مند ہو گئے ہیں مگر شدید غربت کی چپیٹ میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ پڑھے لکھے غریب لوگوں کی زندگی المناک بنتی جا رہی ہے۔

اقبال متین موجودہ مادّی تہذیب سے بہت نالاں ہیں۔ اس مادّی تہذیب کی وجہ سے انسانی واخلاقی قدریں ملیامیٹ ہو رہی ہیں۔ افراد بے حس ہو رہے ہیں۔ افراد کی طرح ہمارے شہر بھی بے چہرہ اور بے حس ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کوئی انفرادی شناخت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس سنگین صورت حال سے اقبال متین سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ شاید اسی لیے ان کے اکثر مرکزی کردار شدید ترین ذہنی اور دماغی الجھنوں اور مستقل بے خوابی کا شکار نظر آتے ہیں۔

اقبال متین کے افسانے فنّی وتکنیکی اعتبار سے بہت متاثّر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فنکارانہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اور فنّی ہنرمندی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ساحرانہ فضا پیدا کرنے اور قاری کو اپنی طرف متوجّہ کرنے میں خاصی کامیاب ہوئی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فضیل جعفری رقم طراز ہیں:

''ہارڈی کی طرح اقبال متین کے افسانوں کا کینوس بھی بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ وہ اختصار سے شدّتِ تاثر پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ ایک کے بعد ایک افسانہ پڑھتے چلے جائیں آپ کو ان میں ایک بھی فالتو جملہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح ان کے یہاں کردار تو ہیں مگر اس طرح کہ ہیرو اور ہیرئن نہیں ہیں جن سے ہم ترقی پسند افسانہ میں عموماً دوچار ہوتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ اقبال متین کے افسانوں میں افسانہ نگار کا خلاّقانہ ذہن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ احساسات وجذبات کو اجاگر کرنے کے لیے ان کا ذہن کرداروں کی تشکیل بھی کرتا ہے اور واقعات کو بھی جنم دیتا ہے۔ انہوں نے خود زبوں آثار میں اعتراف کیا ہے کہ: ''آنکھیں نہیں دیکھتیں، ذہن دیکھتا ہے۔ ٹانگیں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتیں، ذہن بھاگتا ہے۔ ہاتھ کسی کو سینے سے کھینچتے ہیں نہ پرے ڈھکیلنے کا یارا رکھتے ہیں''۔

بیانیے کی یہ تکنیک اور یہ افسانوی اسلوب اقبال متین کی اپنی ایجاد ہے۔''(۸)

حوالے

(۱) عابد سہیل، اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ) مشمولہ، سہ ماہی بادبان (اقبال متین نمبر)، شمارہ نمبر:۱۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء، کراچی۔

(۲) اقبال متین، شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۶۷۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء۔

(۳) ایضاً، ص، ۶۸۱۔

(۴) اقبال متین، چھت، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۷۰۴۔

(۵) اقبال متین، نچا ہوا البم، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۱۸۰، ۸۱۔

(۶) ایضاً، ص، ۱۸۳۔

(۷) اقبال متین، کتاب سے کتبے تک، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اوّل) ص، ۲۱۰۔

(۸) فضیل جعفری، اقبال متین: شہر آشوب کا تنہا مسافر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب، نورالحسنین، ص، ۸۶، ۸۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

سرتاج احمد بدرو
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی، حضرت بل، سری نگر کشمیر

برج پریمی کی ادبی خدمات

Birj paremi ki abdabi Khidmaat by Sartaj Ahmad badroo, research scholar, Dept of Urdu kashmir University,J&K. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 33-38.

برج کشن ایمہ المعروف برج پریمی ریاست جموں وکشمیر کے وہ مایہ ناز محقق اور نقاد ہیں، جنہوں نے اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے فکر وفن اور اپنے آبائی وطن کشمیر کی تہذیب وثقافت اور ادب کو تحقیق وتنقید کے کینوس پر اُبھار کر اپنا نام ریاست اور ریاست سے باہر بلکہ برصغیر کے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا ہے۔ان دونوں موضوعات کے پہلو بہ پہلو انہوں نے فن اور آرٹ کے دیگر پہلوؤں پر بھی لکھا اور قلیل ادبی زندگی میں اردو ادب کو ڈیڑھ درجن کے قریب کتابیں تفویض کیں، جن میں سے چند ایک اردو کے افسانوی ادب کے محققین کے لیے بنیادی ماخذ کا کام کرتی ہیں اور چند ایک کو وادیٔ کشمیر کے اردو طلباء کے لیے یونی ورسٹی نے سیلیبس میں تجویز کر کے شامل کی ہیں۔ برج پریمی ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو درابی یار حبہ کدل سری نگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی اور بعد میں ڈی۔اے۔وی ہائی اسکول مہاراج گنج (سری نگر) سے ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ابھی سری پرتاپ کالج میں ایف۔ایس۔سی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد (پنڈت شیام لال ایمہ جو اپنے زمانے کے مشہور استاد اور ادیب تھے) کا انتقال ہوگیا اور گھریلو ذمہ داریوں کے بہ مؤجب تعلیم کے سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔والد کی خالی اسامی پر انہیں ماڈل اسکول امیرا کدل سری نگر میں بحیثیت ایک کم سن استاد کے ماہوار تیس روپے پر تعینات کیا گیا۔ برج پریمی چوں کہ کچھ سے کچھ بننا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے ملازمت کے دوران ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے تعلیم جاری رکھی اور بی۔ای۔سی (بیسک ایجوکیشن کورس)، ادیب کامل، ادیب فاضل، بی۔اے، بی ایڈ (ٹیچرس ٹریننگ کالج سری نگر ۱۹۵۹ء) اور ایم۔اے (جموں وکشمیر یونی ورسٹی ۱۹۶۲ء) جیسے امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کیے۔ایم۔اے مکمل کرنے کے بعد انہیں پی ایچ۔ڈی کرنے کا بہت شوق تھا لیکن اس کے داخلے کے لیے انہیں تقریباً دس سال کا طویل انتظار کرنا پڑا۔اس کے باوجود انہوں نے اس شوق کو جانے نہیں دیا بلکہ اپنی لگن اور محنت سے اس پر کاربند رہے اور بالآخر کشمیر یونی ورسٹی میں انہوں نے مشہور شاعر، نقاد اور افسانہ نگار پروفیسر حامدی کاشمیری (جو بعد میں اسی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تعینات ہوئے) کی نگرانی میں اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو پر تحقیقی مقالہ بعنوان ''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' لکھا جس پر انہیں ۱۹۷۶ء میں مذکورہ یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سند تفویض ہوئی۔اس دوران وہ اسکولی محکمہ تعلیم میں مختلف ترقیوں سے ہوتے ہوئے سینئر ماسٹر، ایڈیشنل ہیڈ ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، ڈسٹرکٹ سروے آفیسر اور ڈسٹرکٹ پلاننگ آفیسر جیسے ذمہ دار عہدوں پر بھی فائز رہ چکے تھے۔پی ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں اسکولی تعلیم کے محکمے کو خیر باد کہہ کر جامعہ کشمیر کے شعبۂ اردو سے وابستگی اختیار کی اور درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔شعبۂ اردو کو اپنے ادبی ذوق وشوق کی سیرابی کے لیے انہوں نے موزوں اور زرخیز پایا اور پھر اپنے انتقال کے وقت تک اردو ادب کی خدمت انجام دینے میں مشغول رہے۔

جامعہ کشمیر میں استاد ہونے کے تیرہ سال بعد ۱۹۹۰ء میں جب برج پریمی کے گھریلو حالات اقتصادی طور پر خوش گوار ہونا شروع ہوئے تھے، تو اچانک وادیٔ کشمیر میں ہر طرف خوف ودہشت کا ماحول چھا گیا اور مہاجرین کی ایک بڑی تعداد نے ترک سکونت کر کے محفوظ مقامات کی طرف

ہجرت کی۔ برج پریمی نے بھی اپنے اہل وعیال سمیت جموں ہجرت کی اور کسمپرسی کی حالت میں محلّہ افغاناں میں کرایے پر ایک مکان لے کر عارضی سکونت اختیار کی۔ابھی وہ ہجرت کے صدمے میں مبتلا ہی تھے کہ صحت نے بھی ساتھ دینا دھیرے دھیرے چھوڑ دیا اور آخر کار ہجرت کے فوراً بعد ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو جموں میں ہی ان کا انتقال ہوگیا اور اپنے وطن کشمیر سے دور دریائے توی کے ساحل پر نذرِ آتش کیے گئے۔

برج پریمی ایک اہلِ علم پنڈت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ان کے والد اپنے زمانے کے ایک مشہور استاد اور معروف ادیب وشاعر تھے۔اُس دور کے مشہور ومعروف ادباء اکثر ان کے یہاں تشریف لاتے تھے جن میں نندلال کول طالب کشمیری' کشپ بندھو' غلام حیدر چشتی' دینا ناتھ واریکو' شاہد کاشمیری' پریم ناتھ پردیسی' دینا ناتھ دلگیر اور پریم ناتھ بزاز وغیرہ شامل تھے۔ان ادباء کی موجودگی میں شیام لال ایمہ (برج پریمی کے والد) کے گھر پر شعروادب کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن سے برج پریمی کو تحریک ملی اور کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں اس دور کے مختلف رسائل وجرائد نے اہم رول ادا کیا ہے۔ برج پریمی پہلے اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے لیکن والد کے انتقال کے بعد انہوں نے پریم ناتھ پردیسی کو اپنا ادبی مرشد بنایا اور ان سے نہ صرف افسانوں پر اصلاح لی بلکہ ہیئت اور تکنیک کی تربیت بھی حاصل کی۔ چنانچہ اپنی ایک مشہور تصنیف ''کشمیر کے مضامین'' میں وہ پریم ناتھ پردیسی کی اُستادی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نہ صرف یہ کہ میری کہانیوں کی تصحیح کرتے تھے بلکہ کہانی بننے کے فن اور کردار سازی پر لیکچر دیا کرتے تھے میرے ساتھ کبھی کبھی تیجوری المعروف ارون کول بھی ہوا کرتے تھے'' [۱]

برج پریمی نے پہلا افسانہ ۱۹۴۹ء میں لکھا۔''آقا'' کے نام سے ان کا یہ افسانہ روزنامہ ''امرجیوتی'' سرینگر میں شائع ہوا۔آقا کے بعد انہوں نے بہت سے افسانے لکھے جو ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف گراں قدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے جن میں بیسویں صدی (دہلی)' راہی (جالندھر) 'مصور (پٹنہ)' استاد (سرینگر) 'پگڈنڈی (امرتسر)' جیوتی (سرینگر)' فلمی ستارے (دہلی)' سب رنگ (بمبئی) دیش اور گاشہِ آگر (سرینگر) وغیرہ شامل ہیں۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۹۵ء میں ''سپنوں کی شام'' کے عنوان سے شائع ہوکر منظرعام پر آیا۔افسانوں کے پہلو بہ پہلو برج پریمی نے متعدد خاکے اور انشائیے بھی لکھے ہیں اور تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین بھی۔اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا کے بارے میں وہ اپنے اوّلین تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''حرفِ جستجو'' میں لکھتے ہیں:

> ''میری ادبی زندگی کا سفر بیسویں صدی کے نصف میں ایک کہانی کار کی حیثیت سے ہوا اور کافی عرصہ تک میں اپنی روح کا درد اپنی کہانیوں میں انڈیلتا رہا اور اب بھی جب کسی داخلی کرب کی ٹیسیں اندر ہی اندر دور دور تک کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہیں تو کہانی جنم لیتی ہے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کہانی میرا پہلا عشق ہے'' [۲]

۱۹۶۰ء کے آس پاس انہوں نے اردو افسانہ اور ناول سے وابستہ متعدد فن کاروں کے فن پر کئی فکر انگیز مقالے لکھ کر ایک ناقد کی حیثیت سے دستک دی،لیکن ۱۹۷۷ء میں شعبۂ اردو جامعہ کشمیر سے منسلک ہونے کے بعد ان کے تحقیقی وتنقیدی کام تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہوئے۔اگر چہ وہ بیچ بیچ میں کہانیاں بھی لکھتے رہے تاہم تحقیق وتنقید کی طرف وہ زیادہ متوجہ رہے۔۱۹۸۲ء میں ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''حرفِ جستجو'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔یہ کتاب ادبی حلقوں میں کافی سراہی گئی اور اس پر مصنف کو یو۔پی اردو اکادمی کے اعزاز سے نوازا گیا۔اس کتاب میں برج پریمی نے پریم چند،منٹو،کرشن چندر، بیدی وغیرہ جیسے فکشن سے وابستہ فن کاروں کا احاطہ کیا ہے اور ان کی تخلیقات کا فکری وفنی جائزہ حتی الامکان اپنی ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کے تحت پیش کیا ہے۔اس کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے برج پریمی کے ادبی وتنقیدی رویوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں وہ اپنے رفقائے کار جن میں حامدی کاشمیری' شکیل الرحمٰن' عبدالقادر سروری اہم ہیں' کے رجحان ساز تنقیدی میلانات سے مستفید ہوتے رہے۔انہی کے زیر اثر انہوں نے عملی تنقید کی طرف مراجعت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مروجہ تنقیدی رویے سے فرار حاصل نہیں کر سکے۔'پریم چند اور تحریک آزادی، پریم چند کے تکنیکی تجربے، پریم چند اور دیہات، منٹو کے خطوط، سعادت حسن منٹو اور نگار خانے، منٹو بحیثیت ترجمہ کار، پردیسی اور ان کے افسانے، دو زاویے تکون کے (منٹو اور کرشن چندر)، اردو کے چند قدآور افسانہ نگار، مختصر افسانہ اور خواتین' وغیرہ اس مجموعہ میں شامل چند اہم مقالات ہیں۔جن میں بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن مشرقی اور مغربی اصولِ انتقادیات کی بہتر روشنی میں برج پریمی نے اردو کے چند تخلیقی فنکاروں کے تخلیقی عمل اور ان کی تخلیقات کے بعض اہم پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔[۳]

> ''جلوۂ صد رنگ'' وادیٔ کشمیر کی ادبی وثقافتی زندگی سے متعلق تحقیقی مضامین پر مشتمل برج پریمی کی ایک

اور کتاب ہے جو ۱۹۸۵ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آ کر مصنف کو کشمیر کے ایک بے باک ترجمان کی حیثیت سے اردو دنیا میں متعارف کرا گئی۔ یہ کتاب بھی ریاستی کلچرل اکادمی کے اعزاز سے نوازی گئی۔ رمزیت اور ایمائیت کا سہارا لے کر برج پریمی نے اس کتاب میں کشمیر کی ہزاروں سال قدیم تاریخ کو سمیٹا ہے اور اپنی محققانہ جگر کاوی سے کام لے کر کشمیر سے متعلق بہت ساری واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ کشمیر کو دھرتی کے سورگ سے تعبیر کرتے ہوئے وہ زیرِ بحث کتاب میں ''جہاں میں رہتا ہوں'' کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

'' جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صبح سے اپنے ملکوتی حسن اپنے رنگ اور اپنے نو رسے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے۔ یہ وہ خطہ ارضی ہے جہاں کے صدرنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو برمایا ہے۔ یہاں گیان وعرفان کے کتنے سوتے پھوٹتے ہیں۔ آگہی وبصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں اور عقل وعشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں نقش ہیں'' ۴

یہ کتاب جہاں کشمیری کلچر کی عکاس کہی جاسکتی ہے کہ اس میں کشمیری رہن سہن، آثارِ قدیمہ، یہاں کی ادبی شخصیات، روحانی بزرگوں، یہاں کے لوک گیتوں کے سماجی پس منظر، زیب و زینت، خردونوش وغیرہ پر تحقیقی مضامین لکھے گئے ہیں اور کشمیر کو غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں پیش کیا گیا ہے وہیں یہاں کی ادبی تاریخ پر بھی تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ 'اردو افسانہ ریاست میں'، 'اردو نثر ریاست میں' اور 'ریاست جموں وکشمیر میں اردو تنقید و تحقیق' فکر انگیز مقالے ہیں جن کے مطالعے سے یہاں کی ادبی صورتِ حال سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'' جلوۂ صد رنگ کشمیر کے آرٹ، فن، کلچر اور ثقافت کے تناظر میں اسم بامسمّیٰ ہے آپ نے اس میں کشمیر کی تہذیب، ماضی اور حال کو بڑی شگفتہ زبان میں پیش کیا ہے یہ ایک ایسا ادبی جام جہاں نما ہے جس میں کشمیر کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں'' ۵

''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' برج پریمی کی وہ کتاب ہے جس کی بدولت انہوں نے برصغیر میں بحیثیت ایک محقق کے اپنی شخصیت تسلیم کروائی۔ یہ اصل میں ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۷۶ء میں کشمیر یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی۔ دس سال بعد جب ۱۹۸۶ء میں یہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا تو اسے یو۔پی اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں کے اعزازات سے نوازا گیا کیوں کہ یہ منٹو پر پہلا باقاعدہ اور جامع تحقیقی کام ہے اور منٹو کی حیات اور ادبی کارناموں کا نہایت ہی عرق ریزی کے ساتھ اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب منٹو شناسی کے سلسلے میں حوالے کا حکم رکھتی ہے۔ یہ کتاب برصغیر کے مستند محققین اور ناقدین کی توجہ کا مرکز بھی بنی جن میں محمد حسن قمر رئیس، آل احمد سرور، مسعود حسین خاں، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، محمد یوسف ٹینگ اور بیسیوں دیگر شامل ہیں۔ کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے..... منٹو کی حیات' اردو کا مختصر افسانہ منٹو تک' منٹو کی افسانہ نگاری' منٹو کے مضامین، انشائیے اور خاکے' منٹو کے خطوط اور آخری باب میں منٹو کے ان کارناموں سے بحث کی گئی ہے جو انہوں نے ڈراما، ناول، ترجمہ اور صحافت جیسی اصناف ادب میں انجام دیے ہیں۔ مختصراً کتاب میں منٹو کی حیات' شخصیت اور کارناموں کو بنیاد بنا کر ان کے فن کے مختلف اور متنوع پہلوؤں سے مفصل اور مدلل بحث کی گئی ہے اور معتوب کے برعکس سعادت حسن منٹو کو محبوب کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

''ذوقِ نظر'' تحقیقی وتنقیدی نوعیت کی ایک اور کتاب ہے جو جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۷ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں تنقید، افسانہ، شاعری، شخصیات اور فلم کے عنوانات کے تحت کئی بصیرت افروز مضامین شامل ہیں جو مصنف کے سوچ وفکر اور ذہنی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 'اردو کہانی کے بدلتے ہوئے رنگ ۱۹۳۶ء تک، پریم ناتھ پردیسی: شخص اور فنکار، پریم ناتھ پردیسی کی شاعری، منٹو اور شراب، سردار جعفری اور قومی رواداری، کشمیر میں اردو تنقید، منٹو اور ہندوستانی فلم، بیدی اور ہندوستانی فلم وغیرہ اس کتاب میں شامل چند ایسے مضامین ہیں جن میں، برج پریمی نے اپنی تحقیقی صلاحیت اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لا کر ان فن کاروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برج پریمی کے ہاں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید بھی چلتی نظر آتی ہے جس وجہ سے ان کی تحریریں جاذبِ نظر بن جاتی ہیں۔

''چند تحریریں'' برج پریمی کی ایک اور کتاب ہے جو ۱۹۸۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں تحقیق وتنقید' مختصر سفر نامہ' انشائیے' دیو مالا' فلم' نثری مرثیے (شخصی) اور ترجمہ کے عنوانات کے تحت کل ملا کر ۲۳ مضامین شامل ہیں۔ جن کے مطالعے سے برج پریمی کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تحقیق وتنقید کے باب کے تحت اس میں چھ مضامین

درج ہیں یہ ہیں:تحریک آزادی او رارد و ادب'اردو فکشن اور قومی وحدت' قومی وحدت اور اردو شاعری' منٹو کا عہد بوئے خلوص کا متلاشی اور منٹو کی دو کہانیاں ایک اجمالی مطالعہ۔

''تحریک آزادی اور اردو ادب'' زیرِ بحث کتاب میں شامل ایک معلوماتی مقالہ ہے جس میں ڈاکٹر برج پریمی نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو ادب کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ادب کی مختلف اصناف سے وابستہ ادیبوں کی ان تخلیقات کا جائزہ لیا ہے جن میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔افرنگی راج اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف اردو ادب سے وابستہ جن شاعروں 'افسانہ نگاروں'ڈرامہ نگاروں'صحافیوں او ردوسرے قلمکاروں نے اپنے اپنے قلم کی نوک سے انگارے برسائے'برج پریمی نے ان کے تخلیقی عمل میں جدوجہد آزادی کے جذبہ احساس کی جس نرالے انداز سے نقاب کشائی کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔انہوں نے قومیت اور حب الوطنی کے جذبے سے لبریز مختلف اشعار بھی حوالے کے طور پر درج کیے ہیں جس سے ان کے استدلالی انداز بیان کا پتہ چلتا ہے۔غالبؔ'امام بخش صہبائی' فضل حق خیر آبادی'شبلی' چکبستؔ 'سرو رجہاں آبادی'ظفر علی خاں'حسرت موہانی' فیض' اقبالؔ'مجازؔ'سردار جعفری'وامقؔ' کیفیؔ'مخدوم محی الدین'سلام مچھلی شہریؔ وغیرہ جیسے شعراء کے ساتھ ساتھ منشی پریم چندؔ' کرشن چندرؔ'سدرشنؔ'اعظم کریویؔ'علی عباس حسینیؔ' پریم ناتھ پردیسیؔ'منٹو'بیدیؔ'عصمتؔ'اشکؔ'قدرت اللہ شہابؔ'رامانند ساگرؔ'مولوی محمد باقرؔ' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں' ڈرامہ نگاروں او رصحافیوں کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''کشمیر کے مضامین''برج پریمی کی کشمیر شناسی کی ضامن ایک اور کتاب ہے جو۱۹۸۹ء میں منظرِ عام پر آئی اور ریاستی کلچرل اکادمی کے اعزاز سے نوازی گئی،اس کتاب میں بھی ''جلوۂ صد رنگ''ہی کی طرح کشمیر کی ثقافت،تاریخ،شخصیات اور ادب کے بعض مستور پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔پروفیسر حامدی کاشمیری کے مطابق یہ مجموعہ کشمیر کے ادب' تہذیب اور تاریخ کے بعض نئے ابعاد کو روشن کرتا ہے اور پریمی کو کشمیریات کے ایک بالغ نظر ماہر کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ ۶''لل دید کی شاعری'منٹو او رشاعر کشمیر مہجور' کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک' کشمیر میں اردو پروفیسر سروری کے حوالے سے اور جموں وکشمیر میں صحافت'' اس کتاب میں ادب کے باب کے تحت خالص ادبی مضامین ہیں،جو مصنف کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں پر دال ہیں۔

''کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک''ایک فکر انگیز مضمون ہے جو بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد کشمیر میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا ایک ایسا باب ہے جس کے بغیر ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تاریخ مکمل قرار نہیں دی جاسکتی۔ے

''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'': یہ کتاب۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اسے کشمیر یونی ورسٹی نے ایم۔اے کے اردو طلباء کے لیے شاملِ نصاب کیا ہے۔'ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے خدوخال،جموں وکشمیر میں اردو ڈراما،ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات،ریاست کے تمدنی ادارے،جموں وکشمیر میں اردو ادب کے نمائندہ فن کار وغیرہ جیسے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والا کوئی بھی ادبی مؤرخ اس کتاب سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اس تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما' ڈاکٹر برج پریمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو جموں وکشمیر میں اردو شعر وادب اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ان مضامین کی نوعیت تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔کشمیر سے جذباتی وابستگی اور عشق کے باعث ان مضامین میں جہاں تہاں غالبؔ کی طرفداری کا احساس ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر ڈاکٹر برج پریمی کا جو مقصد ہے کہ کشمیر کی شعری'ادبی'صحافتی اور تمدنی زندگی کو متعارف کرایا جائے اور ممکنہ حد تک اس کی بھرپور اور رنگین تصویر پیش کی جائے' ہاتھ سے جانے نہیں پاتا او ریہی اس کتاب کی سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت ہے'' ۸

''منٹو کتھا''منٹو شناسی کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے جو مصنف کے انتقال کے چار سال بعد۱۹۹۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔منٹو اور کشمیر چوں کہ برج پریمی کے پسندیدہ موضوعات تھے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر لکھنا وہ باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ منٹو پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد بھی برج پریمی نے ان کی شخصیت اور فن پر یہ دوسری کتاب لکھی۔پروفیسر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

''برج پریمی صاحب کا کام منٹو پر بنیادی نوعیت کا ہے۔منٹو کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص مرحوم برج پریمی کے کام سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ انہوں نے پوری زندگی اس میں کھپا دی۔ان کا ادبی کمٹ منٹ مثالی تھا۔ان کی دلسوزی'نیکی اور شرافت ان کے رفقاء کے لیے نمونے کا درجہ رکھتی ہے'' ۹

منٹو کی شخصیت اور فکر وفن کے جن گوشوں کی نقاب کشائی کا احاطہ

'سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے' میں نہیں ہوا تھا۔ زیرِ بحث کتاب میں اُن مخفی گوشوں پر سے چادر ہٹا کر منٹو کے فکر وفن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''مباحث' ' ڈاکٹر برج پریمی کے مختلف النوع تحقیقی' تنقیدی' فکری او رتجزیاتی مضامین کا ایک اور مجموعہ ہے جسے ان کے فرزند سبھاش ایمہ (المعروف پریمی رومانی) نے ترتیب دے کر ۱۹۹۷ء میں رچنا پبلی کیشنز جموں کے زیرِ اہتمام شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں کل ملا کر ۲۳ مضامین شامل ہیں۔جن میں سے چند ایک کے عنوانات اس طرح ہیں.....'مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت انشاء پرداز'، 'مختصر افسانے کا آرٹ'، 'لفظوں کا جادوگر: کرشن چندر'، 'حبیب کیفی شخص اور فنکار'، 'کشمیری غزل'، 'کشمیری افسانہ'، 'کشمیری ڈراما'، 'پریم چند اور ہندوستانی فلم'، 'اوپندر ناتھ اشک اور ہندوستانی فلم' وغیرہ۔مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے برج پریمی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مولانا کے نثری اسلوب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ کے بلیغ استعمال سے جادو جگاتے ہیں اور بلاغت کا پورا حق ادا کرتے ہیں....... یہ صحیح ہے کہ سیاسی' فلسفیانہ یا دینی مباحث کو سمجھانا ایک جان لیوا کام بھی ہے اور خشک اور بے حد دقیق کام ہے لیکن مولانا کا اندازہ نگارش ان مباحث کے بیان میں حسن وتاثیر کے عناصر آمیز کرتا ہے'' ۱۰

اس کتاب کی اہمیت مسلّم ہے کہ اس میں تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین کے علاوہ انشایے اور خاکے بھی شامل ہیں اور بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی۔

''پریم ناتھ پردیسی: عہد شخص اورفن کار'' ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک افسانہ نگار اور شاعر کی شخصیت اورفن پرلکھی ہوئی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی ایک اور کتاب ہے جو ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔یہ کتاب کشمیر کے پریم چند یعنی پریم ناتھ پردیسی کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر مفصل کتاب تصور کی جاتی ہے۔اس میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا حق بھی ادا کیا گیا ہے اور کشمیر کے مشہور اردو ادیب کی زندگی اور ادبی کارناموں کو اردو دنیا کے وسیع حلقے تک پہنچانے کی سعی جمیل کی گئی ہے۔

برج پریمی کی جو تصانیف ابھی غیر مطبوعہ ہیں ان میں ''پریم چند:ایک نئی جہت''، ''اردو ادب میں کشمیری پنڈتوں کی خدمات''، ''نئی تحریریں'' وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی ان کی دو کتابیں (وبڑ ھنے ۱۹۹۹ء اور وراثت ۲۰۰۳ء) منظرِ عام پر آئی ہیں۔انہوں نے کشمیری زبان کے ایک مشہور صوفی شاعر صمد میر پر لکھا ہوا مونوگراف بھی کشمیری سے اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ادبی تصانیف کے علاوہ تعلیمِ بالغاں کے سلسلے میں بھی انہوں نے ''مرغ بانی''، ''شجرکاری'' اور ''روشن چراغ'' جیسی کارآمد کتابیں لکھیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ برج پریمی برق رفتاری کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔جامعہ کشمیر میں درس وتدریس سے وابستہ ہونے سے لے کر ان کے انتقال تک ہر سال اُن کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہو کر منظرِ عام پر آتی رہی۔صرف کتابیں لکھتے ہوئے اور درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہی وہ اردو ادب کی خدمت میں مشغول نہیں رہے بلکہ انہوں نے تخلیقی سفر کے دوران متعدد علمی و ادبی انجمنوں سے بھی وابستگی اختیار کی اور ادبی نشستوں میں باقاعدگی کے ساتھ شمولیت کرتے رہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کبھی کبھی اپنے گھر پر بھی ادبی نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔۱۹۵۴ء میں شہرِ سرینگر کے خانیار علاقے میں بہاؤالدین زاہد اور بدرالدین نے ''حلقہ علم وادب'' کی بنیاد رکھی جو کچھ عرصہ بعد ایک مشہور ادبی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔برج پریمی اس کے اراکین میں شامل تھے۔اس ادبی حلقے کی نشستوں میں کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے مشہور ادباء شرکت کرتے تھے جن کے ساتھ برج پریمی کو ملاقات کے مواقع فراہم ہوئے۔اور اس طرح ان کی تخلیقی صلاحیت ادبی ماحول میں پروان چڑھتی گئی۔اسی دور میں گنپت یار سرینگر میں ہندی سنسد نام کی ایک انجمن بھی قائم ہوئی جس کے ساتھ پرتھوی ناتھ جوتشی' سوم ناتھ بالی' رادھا کرشن بے کس' موہن رینہ' راج کمل وغیرہ جیسے ادیب شامل تھے۔ہندی کے معروف ادیب وسنت کمار تیجوری المعروف ارون کول اس انجمن کے صدر اور برج پریمی اس کے سیکرٹری تھے۔۱۹۵۷ء میں زینہ کدل سرینگر میں ایک اور ادبی مرکز ''انجمن اربابِ ذوق'' کے نام سے وجود میں آیا اور برج پریمی بھی اپنے دوست اور معاصر ادیب پشکر ناتھ کے ہمراہ ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہوئے۔اس دوران ان کی ملاقاتیں قدآور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہوئیں جن میں غلام رسول نازکی' دینا ناتھ نادم' امین کامل' رحمٰن راہی' شمیم احمد شمیم' راہی معصوم رضا' سوم ناتھ زتشی اور اختر محی الدین وغیرہ شامل ہیں۔برج پریمی انجمن ادب بڈگام کے ساتھ بھی وابستہ رہے جو بعد میں انہی کی تجویز پر ''انجمن ترقی ادب بڈگام'' کے نام سے ازسرنو منظم کی گئی اور وہ اس کے نائب صدر منتخب کیے گئے۔اس انجمن کی ادبی نشستوں میں برج پریمی نے اپنی کئی کہانیاں پڑھ کر سنائیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر داد وتحسین حاصل کیے۔شاہد بڈگامی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''برج پریمی کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اپنی عمر سے وہ کہیں زیادہ بالغ اور تجربہ کار لگتے تھے۔ انہوں نے انجمن ادب بڈگام کی نشستوں میں شعراء اور ادباء کی تخلیقات پر تنقید کا سلسلہ بھی رائج کیا اور علمی سطح پر ہماری ادبی تحریک کو جدید ادبی رجحانات سے روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا۔'' ۱۱

برج پریمی کلچرل فرنٹ، آزاد کلچرل فورم اور آزاد میموریل کمیٹی سے بھی وابستہ رہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں انہوں نے ''صدف'' نام کی ایک انجمن تشکیل دی۔ جس کی طرف سے یادگار جلسے اور ادبی نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس انجمن کے ساتھ پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر نذیر احمد ملک اور پروفیسر مجید مضمر (مرحوم) جیسی ادبی شخصیات وابستہ تھیں۔

مختصراً برج پریمی نے قلیل عرصے میں ایک طویل ادبی سفر طے کیا اور بہ یک وقت افسانہ نگار، مترجم، صحافی، ناقد، محقق اور مؤرخ کے اردو ادب میں وہ مناسب مقام پایا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ اردو ''بازیافت'' کے نام سے جو سالانہ تحقیقی وتنقیدی مجلّہ شائع کر رہا ہے اس کے مجلس مشاورت کے ایک رکن کی حیثیت سے بھی انہوں نے تحقیقی وتنقیدی کاموں کو بحسن وخوبی نبھایا ہے۔ وہ ملک کے متعدد رسائل و جرائد سے بالواسطہ یا بلا واسطہ بھی وابستہ رہے ہیں جن میں ماہنامہ ''دیس'' (سرینگر) استاد (سرینگر) آگہی (شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی) صدف (سرینگر) او رہندوپاک کے مشہور ماہنامہ سہیل (گیا) وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی کئی ادبی اور ثقافتی انجمنوں سے بھی ان کا تعلق رہا جو ان کے متحرک ذہن، تخلیقی وفور اور قلم کی روانی کا پتہ دیتا ہے۔ برج پریمی کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب نگارش ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ بے ساختہ پن بھی موجود ہے۔ ریاست میں اردو ادب کو فروغ دینے میں ان کے کلیدی رول کو کوئی بھی ادبی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

حوالہ جات:

۱۔ برج پریمی ''کشمیر کے مضامین''، دیپ پبلی کیشنز سری نگر ۱۹۸۹ء، ص ۴۷
۲۔ برج پریمی ''حرفِ جستجو''، دیپ پبلی کیشنز سری نگر ۱۹۸۲ء، ص ۱۱
۳۔ ایضاً ص ۷
۴۔ برج پریمی ''جلوۂ صد رنگ''، دیپ پبلی کیشنز سری نگر ۱۹۸۵ء، ص ۱۵
۵۔ ماہ نامہ حریم ناز، جموں برج پریمی نمبر، ماہِ ستمبر اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۴۱
۶۔ برج پریمی ''کشمیر کے مضامین'' دیپ پبلی کیشنز سری نگر ۱۹۸۹ء، ص ۱۳
۷۔ بحوالہ ''برج پریمی ایک مطالعہ'' مرتبہ پریمی رومانی، دیپ پبلی کیشنز جموں ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۵
۸۔ ''برج پریمی ایک مطالعہ'' مرتبہ پریمی رومانی، دیپ پبلی کیشنز جموں ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۷
۹۔ بحوالہ 'سپنوں کی شام' (افسانوی مجموعہ برج پریمی)، دیپ پبلی کیشنز جموں ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۴
۱۰۔ برج پریمی ''مباحث''، رچنا پبلی کیشنز جموں ۱۹۹۷ء، ص ۱۳
۱۱۔ بحوالہ ''برج پریمی: شخصیت اور فن'' مرتبہ پریمی رومانی، رچنا پبلی کیشنز جموں ۲۰۰۳ء، ص ۳۱

☆☆☆☆

Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
Vol.:II, Issue:I Jan.-March 2015

محمد قمر
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵
م ن۔9990111306

علی سردار جعفری کے تنقیدی افکار

Ali sardaar jaafri ke tanqeedi afkaar by Mohd. Qamar, research scholar, Jamia Millia Islamia,New Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 39-43.

علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء تا ۲۰۰۰ء) ترقی پسند تحریک کے مبلغ اور اس سے بڑھ کر اردو کے عظیم شاعر، افسانہ نگار، مفکر اور نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ محض صاحبِ اسلوب شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ترقی پسند اصول ونظریات کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ ان کی ذہنی نشوونما میں اردو کے قدیم ادبی روایات، کلاسیکی اقدار وافکار اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی ماحول کا بھرپور عمل دخل رہا ہے۔ انھوں نے جس وقت ادب کی دہلیز پر قدم رکھا اس وقت پورا ملک آزادی کی جدو جہد اور برطانوی حکومت کے خلاف آواز بلند کر رہا تھا۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ دور ہر اعتبار سے انقلابی ثابت ہوا ہے۔

سردار جعفری بچپن سے ہی ذہین اور حاضر جواب تھے جس کی وجہ سے گھر کے افراد اور اسکول کے اساتذہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے تخلیقی ذہن کا استعمال اسکول کے زمانے سے ہی شعروشاعری اور افسانے وغیرہ میں طبع آزمائی کے ذریعے کرنے لگے۔ لیکن جب انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے کا موقع ملا تو وہاں کی علمی وادبی فضا نے ان کے فکری ذہن میں مزید اضافہ کیا۔ علی گڑھ کی اس زرخیز وادی میں ان کے رفقائے کار کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ ان میں اختر حسین رائے پوری، سبطِ حسن، حیات اللہ انصاری، منٹو، مجاز، جانثار اختر اور آل احمد سرور جیسے ہونہار طلبہ سے تبادلۂ خیال اور ساتھ میں وقت گزارنے کا موقع بھی فراہم ہوا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی جس میں انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) اور پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸) نے دنیا کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو حد درجہ متاثر کیا۔ اس انقلاب نے دنیا کے بہت سے ممالک میں ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ عوام اور مزدور طبقے میں بھی تحریک پیدا کی۔ جس سے تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ عوام ومزدور بھی سرمایہ دارانہ اور ظالم حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس کے مقام پر کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ہونے والی کانفرنس نے تخلیق کاروں میں ایک حرکت پیدا کی۔ ان دنوں کچھ ہندوستانی طلبہ جو لندن میں زیرِ تعلیم تھے پیرس کانفرنس سے متاثر ہوکر ایک انجمن قائم کی اور اس کا باقاعدہ مینی فیسٹو بھی تیار کیا۔ اس مینی فیسٹو کو ہندوستان میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے پاس بھیجا گیا۔ جسے تمام ادیبوں اور شاعروں نے خیر مقدم کیا۔ ان ادیبوں میں بزرگ ادیب پریم چند نے اس مینی فیسٹو کو دل سے لگایا اور اس کو اپنے رسالہ ''ہنس'' میں ایک اداریہ لکھ کر شائع بھی کیا۔ اس مینی فیسٹو سے متاثر ہوکر اختر حسین رائے پوری نے ایک مضمون ''ادب اور زندگی'' تحریر کیا۔ جسے نوجوان ادیبوں نے خوب سراہا۔ اسی مضمون سے متاثر ہوکر سردار جعفری نے بھی ایک مضمون ''جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' لکھا جو پہلی بار ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں سردار جعفری نے بھی وہی جذباتی اور باغیانہ رویہ اختیار کیا جو اختر حسین رائے پوری نے اپنایا تھا۔ آزاد نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''روایت، قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعروں میں ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ لیکن بعض نوجوان اسے بے جا قیود کا نام دے کر مغرب کی تقلید میں بلینک ورس کی طرف

راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیزیں پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بد نما دھبّہ ہیں۔'' (نیا ادب: اپریل ۱۹۳۹ء)

سردار جعفری کے بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ وہ آزاد نظم کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ نوجواں ادیبوں اور شاعروں کو مغربی ادب کی تقلید سے منع کیا اور کہا کہ ایشیائی ادب کا دل سے احترام کیا جائے۔ لیکن جب انہیں یہ احساس ہوا کہ غزل ان کے مزاج کے خلاف ہے کیونکہ غزل کی اکہری طبیعت انہیں راس نہ آئی تو سردار جعفری نے غزل کو ترقی پسند دائرے سے خارج کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے باوجود بھی یہ کہتے ہیں کہ ''غزل اپنی تمام سابقی خصوصیات کے ساتھ اردو ادب کی گردن پر ابھی سوار ہے۔'' سردار جعفری شروع سے ہی رجعت پسند ادب کے خلاف تھے کیونکہ ان کا فکری رجحان اجتماعی ادب کی طرف تھا۔ وہ مانتے ہیں کہ شاعری یا ادب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہونا چاہیے۔ کیونکہ ادب کا تناور درخت جو شاعروں اور ادیبوں کی ذہنی فضا میں تیار ہوتا ہے، اپنی جڑوں کی آبیاری کے لیے عوام کے دماغوں کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے ادب کو عام زندگی سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

سردار جعفری کی تنقیدی تحریروں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کہیں بھی اپنے آپ کو نقاد کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نہایت انکساری کے ساتھ ایک قاری اور ادیب کی حیثیت سے اپنے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیے ہیں کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔'' (ترقی پسند ادب: از۔ علی سردار جعفری۔ ص ۱۱)

اس کے علاوہ انہوں نے ترقی پسند جمالیات کی شیرازہ بندی کا بھی اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ جیسا کہ ان کی اس تحریر سے ظاہر ہے:

> ''ترقی پسند تحریک جمالیات کے سائنٹفک اور علمی تصوّر ہی کو اپنا سکتی ہے۔ وہ اس پیمانے سے ادب کی رفتار ناپتی ہے اور اسی کسوٹی پر اسے کستی ہے۔ وہ ادب کو مستقل ابدی اور غیر تغیر پذیر قدروں کی قائل نہیں ہے کیونکہ اس کا تصوّر تاریخی اور سماجی ہے۔ وہ ادب کو تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کے ساتھ دیکھتی ہے اور ادب کو بھی تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کا آلۂ کار سمجھتی ہے۔'' (ترقی پسند ادب: ص ۳۱)

سردار جعفری کے ان تصوّرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک میں جمالیات کے سائنٹفک تصوّر کے ذریعے ہی ادب کی صحیح معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس طرح کے ادب میں انتہا پسندی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے بارے میں سردار جعفری کا یہ خیال ہے کہ مزدور اور عوام کی اکثریت جہالت کا شکار ہے۔ ہمیں ان سے ہمدردی ضرور ہے لیکن وہ ادب کی کلاسکیت سے واقف نہیں۔ اگر ہم ان کی سطح پر اترتے ہیں تو ہمارا ادب گھٹیا اور سستا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے:

> ''ہم ادیب ہیں ہمارا کام ادب کی تخلیق کرنا ہے اگر ادب میں فن ہی ہاتھ سے چلا گیا تو کیا باقی رہ جائے گا محض برہنہ موضوع، نعرے بازی اور پروپگنڈہ۔''

سردار جعفری نے ان ہی خامیوں کی بنیاد پر رجعت پرستوں پر لعن طعن کیا ہے۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ ادیب کو ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی جدوجہد میں بھی عملی حصہ لینا چاہیے کیونکہ ہمارے ادب میں مزدور اور عوام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے ترقی پسند ادب کے ذریعے سماج کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

> ''قدیم یونانیوں نے کہا تھا کہ صرف دیوتا اور شاعر تخلیق کرتے ہیں۔ آج ہمیں یہ کہنا ہے کہ صرف مزدور (عوام) اور شاعر (ادیب، فنکار) تخلیق کرتے ہیں۔ اگر ہمارا اور ان کا اتحاد نہیں ہوا تو ان کی تخلیق نامکمل رہ جائے گی اور ہماری تخلیق بھونڈی اور جھوٹی ہوگی۔ اس لیے ادیبوں اور مزدوروں کا اتحاد تخلیقی اتحاد ہے۔'' (ترقی پسند ادب: ص ۵۸ تا ۵۹)

سردار جعفری کے ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی تخلیق میں عوام کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے کیونکہ ان دونوں کے اتحاد سے ہی اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق ہونا ممکن ہے۔ ہر ادب کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ دنیا کے ادب میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے جو بے مقصد اور غیر جانبدار ادب ہو؟ سماج میں بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جس کو کوئی ادیب اچھا سمجھتا ہے اور کوئی برا۔ کوئی ادیب اسے کھل کر بیان کرتا ہے تو کوئی اشارے اور کنائے میں۔ یہ تو ان کے اندازِ بیان کا فرق ہے۔ سردار جعفری اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر ادیب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ سماجی مسائل کو سمجھے اور پھر سماج کو ترقی کی طرف لے جانے میں مدد فراہم کرے۔ ترقی پسند ادب کے مقاصد پر جعفری کا یہ خیال ہے:

''...وہ ادب کو عوام کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور اس پر زندگی کے سدھارنے اور سنوارنے کے مقدس فرائض عاید کرتے ہیں اور جدوجہد حیات میں اسے ایک حربے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ادب کے مسائل وہی ہیں جو زندگی کے مسائل ہیں۔ادب کے موضوعات بھی زندگی کے موضوعات سے الگ نہیں ہو سکتے اور آج کے ہندوستان میں وہ موضوعات وہی ہیں جن کا ذکر ترقی پسند مصنفین کے پہلے اعلان نامے میں کیا گیا تھا۔'' (ترقی پسند ادب:ص۴۵)

علی سردار جعفری کے ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب میں مقصدیت کا ہونا لازمی ہے۔جس سے زندگی میں بہتری آسکے کیونکہ ادب زندگی کی جدوجہد میں ایک حربے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔وہ سنجیدہ ادب کے لیے موضوع اور ہئیت کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں کیونکہ شاعری میں یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں۔شاعری کے لیے ایسا میعار قائم کیا جائے جو نہ صرف فنی اور جمالیاتی خوبیوں پر پورا اترے بلکہ موضوع اور حسن کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہوں۔شاعری میں موضوع کو خارج کر کے ادب کو دلکش اور حسین نہیں بنایا جا سکتا ہے۔اچھے ادب کے لیے ان تمام خوبیوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند مصنفین کے بھمڑی کانفرنس میں ادب کے لیے نیا منشور نامہ تیار کیا گیا۔جس سے تحریک کو بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اس کانفرنس کے بعد بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے فکری رویے میں تبدیلی آگئی یہاں تک کہ سردار جعفری نے بھی بعض معاصرین پر تنقیدی وار کرنا شروع کر دیا۔اسی تعلق سے انہوں نے ایک مضمون ''ترقی پسند کے بعض بنیادی مسائل'' لکھا جس میں فیض احمد فیض کی مقبول نظم ''صبح آزادی'' کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فیض نے ۱۵/اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔اس نظم کا پہلا شعر ہے

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اور آخری مصرع ہے

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیکن یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں''۔کیونکہ انہوں نے پاکستان کے لیے چھ صوبوں کا مطالبہ کیا تھا لیکن انہیں ملے مغربی پاکستان میں ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔پھر کیوں نہ ترقی پسند عوام کے بجائے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اسے اپنا قومی ترانہ بنالیں اور ڈاکٹر ساور کر اور گاڈ سے بھی یہی کہتے ہیں کہ ''وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'' کیوں کہ اکھنڈ ہندوستان نہیں ملا جسے وہ بھارت ورش اور آریہ ورت بنانے والے تھے۔پوری نظم میں اس کا کہیں پتا نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی انقلاب کی منزل۔اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے،شب گزیدہ سحر ہے،حسینانِ نور کا دامن ہے،فضا کا دست ہے، تاروں کی آخری منزل ہے،نگارِ صبا ہے، چراغِ سرِ راہ ہے،پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی،غلامی کا درد اور اس درد کا مداوا۔ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔'' (بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔از۔خلیل الرحمٰن اعظمی ص۱۱۲)

سردار جعفری نے بالا سطور میں فیض اور ان کی نظم کو غیر ترقی پسند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نظم کو مقصدیت سے خالی اور ہئیت پرستی سے منسوب کیا ہے۔اس اقتباس میں سردار جعفری ایک اور پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ فیض مسلم لیگی فکر سے قریب نظر آتے ہیں کیونکہ مسلم لیگی رہنماؤں نے سیاسی بنیاد پر تقسیمِ ملک کی حمایت میں تھے۔جب کہ فیض کی کسی بھی تحریر یا کلام میں یہ بات نہیں ملتی ہے کہ وہ ملک کا بٹوارہ چاہتے تھے۔بلکہ فیض نے یہ نظم ملک میں تقسیم کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ظلم وتشدد سے متاثر ہو کر لکھی۔فیض کی نظر میں یہ آزادی ہندوستانی عوام کے لیے دھوکہ ثابت ہوئی۔سردار جعفری آگے لکھتے ہیں کہ فیض نے عوامی انقلاب اور عوامی آزادی کی کوئی بات نہیں کی ہے جب کہ اس دور میں فیض کی لکھی ہوئی بیشتر نظمیں مثلاً ''رقیب سے، تنہائی، موضوعِ سخن، ملاقات اور نثار میں تیری گلیوں کے'' وغیرہ اجتماعی اور سماجی مسائل کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔فیض کی بڑی خوبی یہ رہی ہے کی انہوں نے سماجی اور اجتماعی مسائل اور عشقیہ تجربات کے لطیف پہلو کو ترقی پسندانہ خیالات میں بیان کیے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے کسی بھی مسائل کو سیدھا سادہ انداز میں بیان کرنے کے بجائے علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیا ہے۔جس سے اکثر ناقدین اور شعرا کو ان کی ترقی پسندی پر شک ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح جب سردار جعفری دوسرے شاعروں کی تخلیقات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ان کا انداز جذباتی ہو کر رہ جاتا ہے۔اگر چہ انہوں نے بہت سے ترقی پسند شعرا مثلاً راشد،اختر الایمان،فیض اور مخدوم وغیرہ پر کئی طرح کے اعتراضات قائم کیے۔جسے ترقی پسند حلقے میں بھی حمایت نہیں مل سکی۔

لیکن جب سردار جعفری اقبال کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں

اپنی تنقیدی صلاحیت کا بہترین نمونہ پیش کرنے کیا ہے۔انھوں نے اقبال کو سرسید،حالی اور شبلی کی روایت کا امتزاج بتایا اور یہ بھی کہا کہ علم وفن کی سطح پر اقبال زیادہ بلند ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سرسید اور حالی کی روایت کو آگے بڑھایا اور ساتھ ہی سماجی تضادات،الجھاؤ اور غیر جمہوری روایت کو بھی مستحکم کیا۔سردار جعفری اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابھی تک اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔وہ ہمہ گیری اور وسعت ابھی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔یہ قومی تحریک آزادی کے ابتدائی ابال کا زمانہ تھا جو اپنے سارے تضاد کو لے کر اقبال کی شاعری میں ڈھل گئی۔''(ترقی پسند ادب:ص۱۰۲)

سردار جعفری کو اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوا کہ ان سے بڑا عظیم شاعر ابھی تک اردو ادب میں پیدا نہیں ہوا ہے کیونکہ ان کی شاعری میں اصلاح پسندی اور ماضی پرستی دونوں رجحانات موجود ہیں۔وہ شاعری کی ابتدائی دور سے ہی حب الوطنی اور سامراجی حکومت کے خلاف نعرے بلند کر رہے تھے جو آخر تک ان کی شاعری میں قائم رہا۔سردار جعفری کے نزدیک اقبال کے خودی کی بنیاد عینیت کے فلسفے اور ہیگل کی جدلیت پر مبنی ہے جس کو انہوں نے اسلامی فلسفے اور روایت کا پیکر عطا کیا۔جو کہ بعد کی شاعری میں مردِ کامل کے ساتھ شاہین کی علامت کو خوب سراہا گیا۔اقبال نے ان علامت میں ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی کی تمام خصوصیات کو پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔اس تعلق سے سردار جعفری کا خیال ہے:

''اقبال نے اپنے اس شاہین کو تیمور،ابدالی،نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار اور افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے۔اور یہ ڈکٹیٹر(شاہین) جب ابی سینا میں 'حمام وکبوتر' کے شکار کے لیے نہیں بلکہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے۔'' (ترقی پسند ادب:ص۱۰۸)

سردار جعفری نے بالا سطور میں اقبال کے شاہین کو مختلف ناموں سے منسوب کیا ہے اور آخر میں لفظ ڈکٹیٹر سے بھی مخاطب کیا۔ان کا ماننا ہے کہ اقبال کے یہاں مستقل تضاد ہے وہ اپنی شاعری میں جس حسین وجمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔وہ فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد فراہم کرتا ہے۔اسی لیے اگر اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو فلسفیانہ شخصیت سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ شاعر بڑے اور فلسفی چھوٹے نظر آتے ہیں۔

سردار جعفری کا یہ ماننا ہے کہ اقبال کو ماضی پرستی اور مذہبی احیا کے تصورات ورثے میں ملے۔اس دور کے ادب میں سامراج اور انگریزی سرمایہ داری کے ظلم وستم کا ذکر نظروں سے بوجھل رہا ہے لیکن اقبال کی نظروں سے وہ چیزیں پوشیدہ نہیں رہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس کے خلاف آواز بلند کی اور سرمایہ داری کے برخلاف جدوجہد کر کے انسانوں کو وہ عظیم الشان تصور دیا جو غالباً اردو ادب کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔سردار جعفری یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال کی درویشی،قلندری،شاہنی اور انفرادیت پسندی سے ہمارے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن ہم ان تصورات کے بنیاد پر اقبال کی ترقی پسند پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

سردار جعفری جب اقبال کے کلام کے مختلف ادوار پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی خودی کے استحکام کے سارے عناصر ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری کے خاص وسائل ہیں۔ان کی شاعری نے مشرقی عوام کو خواب سے بیدار کر کے ملک کی جدوجہدِ آزادی کی تحریک میں شامل کیا۔سردار جعفری کے الفاظ میں:

''اقبال نے ان تصورات سے اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعری کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ہم اس سرمائے کی قدر کرتے ہیں اور اس کے لیے اقبال کا بے انتہا احترام ہمارے دل میں ہے۔اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور نہیں کر سکتے۔''(ترقی پسند ادب ص۱۱۷)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سردار جعفری اقبال کے شاعرانہ تصورات سے کافی حد تک متاثر رہے۔وہ مانتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کے بیشتر خیالات آج کے ترقی پسند شاعروں کی رگوں میں نظر آتا ہے اور ان کے خیالات ترقی پسند شاعروں کے لیے مثلِ راہ ثابت ہوئے۔یہاں تک کہ سردار جعفری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کے بغیر جدید شاعری کا تصور ممکن نہیں۔

شاعری کے بعد جب سردار جعفری اردو نثر پر نظر ڈالتے ہیں تو

وہاں بھی انہیں حقیقت نگاری اور رومانیت کے تصورات کافی اہم معلوم ہوتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ عوام کی زندگی اور ان کے حالات کی سچی تصویر بنانا حقیقت نگاری کا خاص جز ہے۔

جدید ادب کے ابتدائی دور میں عقل پسندی، حب الوطنی، انسان دوستی اور سامراج دشمنی کا جذبہ زیادہ غالب رہا ہے لیکن اس جذبے میں انقلاب کی مہک آرہی تھی جس میں اقبال اور چکبست جیسے عظیم شعرا اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ان کے بعد پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے اردو ادب کی رہنمائی کی۔ یہ الگ بات ہے کہ پریم چند نے حقیقت کے دامن کو نہیں چھوڑا اور جوش نے رومانیت کا۔لیکن جوش کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا بھی عکس نظر آتا ہے ورنہ ان کا ادب فراری کی صورت اختیار کر لیتا۔سردار جعفری کا خیال ہے کہ پریم چند میں ٹالسٹائی کی روح ملتی ہے اور جوش کے یہاں شیلی کی۔ پریم چند کے حوالے سے سردار جعفری کا یہ خیال ہے:

> ''پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو بنیادیں قائم کی ہیں وہ بڑی صحت مند ہیں اور انہیں بنیادوں پر مستقبل کے اردو ادب کی عمارت کھڑی ہوگی۔ ہر بڑا ادیب اپنے عہد کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی ضرور کرتا ہے اور اس اعتبار سے پریم چند کی عظمت مسلّم ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے انقلاب کے بنیادی سوال کو اپنے ادب کا مرکزی نقطہ بنالیا۔اور وہ کسانوں کا سوال ہے جسے انہوں نے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔'' (ترقی پسند ادب ص۱۲۳)

سردار جعفری کے ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے اپنی حقیقت نگاری کا موضوع کسانوں کو بنایا۔ کیونکہ وہ کسان اور متوسط طبقے کی زندگی سے بہت اچھی طرح واقف رہے بلکہ وہ خود اسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے۔سردار جعفری یہ مانتے ہیں کہ جس طرح پریم چند نے اردو ادب کو بحران سے نجات دلایا ٹھیک اسی طرح جوش نے بھی اردو شاعری کے لیے نئی راہیں تلاش کیں۔لیکن دونوں میں بنیادی فرق حقیقت پسندی اور رومانیت پسندی کا تھا۔جوش کی رومانیت پسندی پر سردار جعفری کہتے ہیں:

> ''جوش سو فیصد رومانی شاعر ہیں اور ان کا انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے۔جس کے زیرِ اثر وہ بہت جلد مشتعل ہوکر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں اور مجاہد کی شان سے نیزہ ہلاتے اور تلوار چلاتے میدان میں اتر آتے ہیں۔ یہ جوش کی رومانی فطرت ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ کبھی ان کا انقلاب مٹھیوں میں افشاں بھر کر چلتا ہے اور کبھی سرمایہ داروں کی ہڈیاں چباتا ہوا، کبھی وہ نئی دلہن کی طرح خوبصورت ہوتا ہے اور کبھی دیو کی طرح مہیب اور دہشت ناک۔...اصل میں ان کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے اور وطن کی آزادی کے لیے وہ اس قدر بیتاب ہوجاتے ہیں کہ واقعات اور حالات کی رفتار میں اپنے تخیل کی سرعت پرواز نہ پاکر مایوس ہونے لگتے ہیں۔'' (ترقی پسند ادب ص۱۴۰)

سردار جعفری جوش کی شاعری کو سو فیصد رومانی اور ان کے انقلابی تصور کو بھی رومانی سمجھتے ہیں لیکن آگے یہ بھی کہتے ہیں کہ جوش کبھی کبھی اپنے جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں جس سے ان کے انقلاب میں رومانی عنصر زیادہ غالب ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ سے ان کی شاعری کبھی دلہن کی طرح خوبصورت تو کبھی دیو کی طرح مہیب اور دہشت ناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔جس سے ان کی شاعری میں رومان اور انقلاب کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہوجاتی ہے اور نقاد کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کی رومانی شاعری انقلابی شاعری سے بہتر ہے یا انقلابی شاعری رومانی سے۔

سردار جعفری کی تنقیدی تحریروں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی سرکشی بھی پائی جاتی ہے۔مثلاً جب وہ اقبال کی شخصیت اور کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں اپنی عملی اور تجزیاتی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔لیکن اسی تجزیاتی مطالعے میں کچھ ایسی بھی باتیں کہہ جاتے ہیں جس سے ان کی ناپختگی اور کم علمی ظاہر ہونے لگتی ہے۔

سردار جعفری کی تحریروں میں مارکسی تنقید کا بہترین عکس نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی شاہکار تصنیف ''ترقی پسند ادب'' دبستانِ تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔جس میں انھوں نے تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ ترقی پسند مصنفین کی تاریخ، اس کا پس منظر اور اس کے بنیادی مسائل پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ شاعری میں حقیقت نگاری اور رومانیت کے تصور کو واضح طور پر بیان کیا۔مزید یہ کہ اقبال شناسی میں بھی اپنی تنقیدی بصیرت گراں قدر کارنامہ پیش کیا ہے۔سردار جعفری کی زبان سلیس اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں تلخ اور جارحانہ صورت بھی اختیار کر لیتی ہے لیکن ان چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود ان کی تنقیدی بصیرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی ان کی مقبولیت پر کوئی آنچ آئی۔

☆☆☆

کوثر جہاں
(ریسرچ اسکالر)
جامعہ ملیہ اسلامیہ, نئی دہلی

اردو کے مختلف نام

Urdu ke Mukhtalif naam by Kausar Jahaan, research scholar, Jamia Millia Islamia,New Delhi. Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 44-46.

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے[1]

داغ نے جس 'اردو' پر ناز کیا ہے وہ ہمیشہ سے اردو نہ تھی بلکہ مختلف ادوار میں 'اردو' کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلے ہندوستان کی نسبت سے اسے 'ہندوی' کہا گیا۔ حافظ محمود شیرانی سے لے کر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی تک لسانی محققین اس بات پر متفق ہیں۔ قدیم لغات اور ادبی تصنیفات میں بھی اس کا نام 'ہندی' یا 'ہندوی' ہے۔ اسی لیے ۸۱۲ھ میں 'قاضی خاں بدر' سے لے کر ۱۷۴۲ میں 'سراج الدین خاں آرزو' تک سبھی قدیم لغات نویسیوں نے ہندوستان کی زبان کو 'ہندی' یا 'ہندوی' لکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی، اور پھر ریختہ کہا گیا۔ اور یہ نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس ترتیب سے میں نے انھیں درج کیا ہے۔''[2]

میر اثر (پیدائش ۱۷۵۸،۵۹۔ وفات ۱۷۹۴) نے اپنی مثنوی 'خواب وخیال' کی ابتدا میں اپنی زبان کو 'ہندوی' قرار دیا ہے:

فارسی سو ہیں ، ہندوی سو ہیں
باقی اشعارِ مثنوی سو ہیں[3]

اس عہد کے دیگر صوفیاء کرام کی ادبی تصانیف میں بھی 'ہندی' یا 'ہندوی' کا ہی استعمال ہوا ہے۔ 'شاہ میراجی شمس العشاق' (وفات ۱۴۹۶)، 'شاہ برہان الدین جانم' (وفات ۱۵۸۲) اور جعفر زٹلی (۱۷۱۳۔۱۶۵۷) کے ساتھ ہی 'عبدل بیجاپوری' کی کتاب 'ابراہیم نامہ (۱۶۰۳)'، ملا وجہی کی 'سب رس (۱۶۳۵)'، اور فضلی کی 'دہ مجلس (۱۷۲۳)' وغیرہ سب میں اردو کا نام 'ہندوی' ہے۔

'ہندوی' کے بعد اردو کا دوسرا مقبول نام 'ریختہ' ہے۔ لغت میں 'ریختہ' کے متعدد معنی ہیں مثلاً بننا، ایجاد واختراع کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا اور موزوں کرنا، پریشان وگری پڑی چیز وغیرہ۔ آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری، پڑی پریشان چیز۔''[4]

لیکن شروعات میں ریختہ کا استعمال بالکل الگ معنی میں ہوا یعنی مقامی راگوں اور فارسی کو ملا کر ہندوستانی موسیقی میں جو اختراع وجود میں آئی اس کو 'ریختہ' کہا گیا۔ اسی لیے مختلف زبانوں اور بولیوں کے امتزاج کی بنا پر استعارۃً اردو بھی ریختہ کہلائی۔

زبان کے لیے 'ریختہ' شہنشاہ اکبر کے عہد میں غالباً پہلی بار استعمال ہوا مگر یہ استعمال صرف شاعری تک محدود تھا۔ بولی جانی والی زبان یا نثری کاوشوں کے لیے 'ہندی' کا ہی استعمال ہوتا رہا۔ اس کی وجہ بھی غالباً موسیقی تھی کیوں کہ بعض قدیم غزلوں میں فارسی اور ہندوی کا پر لطف امتزاج ملتا ہے۔ اس سلسلے میں 'امیر خسرو' نے خصوصی شہرت پائی:

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوندیس[5]

اور ان کی یہ غزل بہت مشہور ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسی کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک ازدل دو چشم جادو بصد فریبم ببرو تسکیں

بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے وراے راکھوں جو جاے پاوں پیا کی کھتیاں[6]

خسروں کے بعد سعدی نے ریختہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ مصحفی تک 'ہندوی' اور 'ریختہ' دونوں اردو شاعری کے لیے مستعمل تھے۔ چنانچہ مصحفی کہتے ہیں:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج[7]
کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

یوں تو 'ریختہ' کی اصطلاح ایک خاص قسم کی شاعری کے لیے مستعمل تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ریختہ کا لفظ تمام شاعری کے لیے مقبول ہو گیا۔ بیشتر قدیم شعراء نے شاعری یا اردو زبان کے لیے ریختہ کا لفظ استعمال کیا۔ چنانچہ شاہ حاتم، قائم، مرزا قتیل، میر تقی میر، سودا، مصحفی، سوز اور جرأت سے مرزا غالب کے وقت تک سبھی کے کلام میں یہ لفظ ملتا ہے اور سبھی نے اسے شاعری کا مترادف جانا۔ بقول غالب:

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر نے اپنے تذکرہ 'نکاۃ الشعراء' میں یوں لکھا:

''معلوم ہو کہ ریختہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ان تمام میں جو کچھ فقیر کو معلوم ہے وہ لکھا جا رہا ہے۔ پہلا وہ کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی۔''[8]

ولی اور سراج سے لے کر میر تقی میر کے عہد تک 'ریختہ' کا لفظ شاعری کے لیے ایک مخصوص انداز میں مقبول ہو چکا تھا۔ بقول ولی:

ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے
سنے تب اس کوں جان و دل سوں حسّانِ عجم آ کر[9]

اس زمانے تک 'زبان' کے لیے 'ہندی' کا لفظ اور مخصوص شاعری کے لیے 'ریختہ' کا لفظ استعمال ہوتا رہا۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شمال میں 'ریختہ' اور 'ہندی'، ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے یکساں مقبول تھے۔ یہ حالت اٹھارویں صدی تک رہی۔ وسط انیسویں صدی سے زبان کے نام کی حیثیت سے 'ہندی' کو 'ریختہ' پر ترجیح دی جانے لگی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں بول چال کی زبان کو تقریباً ہمیشہ 'ہندی' ہی کہا جاتا تھا، جب کہ اٹھارویں صدی میں 'ریختہ' کو بول چال کی زبان کے لیے بے تکلف استعمال کرتے تھے۔''[10]

ریختہ کے بعد ہماری زبان کے لیے لفظ 'اردو' کا استعمال شروع ہوا۔ اردو 'ترکی' زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے لشکر یا چھاونی۔ 'حافظ محمود شیرانی' نے لفظ اردو کے لیے تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے۔ بقول شیرانی:

''یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردا، اوردہ، اردہ، اردا اور اردو جس کے معنی فرودگاہ، لشکر اور پڑاو نیز لشکرو حصۂ لشکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ، بازار، لشکر، حرم گاہ، محل محل سرائے شاہی و قلعے پر بھی ہوتا ہے۔''[11]

ہندوستان میں سب سے پہلے اردو لفظ کا استعمال شہنشاہ بابر نے 'تزک بابری' میں کیا ہے۔ بقول شیرانی بابر اپنی ٹکسال کو بھی اردو کہتا تھا۔ جب کہ اکبر کی لشکری ٹکسال 'اردو ظفر قرین' یا 'اردوئے ظفر قرین' اور خال خال موقعوں پر 'اردو' بھی کہلاتی تھی۔ لشکر کے لیے اردو معلیٰ اکبر کے عہد میں مروج تھا۔ بقول شیرانی اکبر کے عہد میں یہ لفظ مقبول ہو چکا تھا۔ چنانچہ شیرانی نے اردو علیہا، اردوئے معلیٰ، اردوئے لشکر، اردو حضرت، اردو ظفرین، اردوئے عالی اور اردوئے بزرگ جیسی تراکیب گنوائی ہے۔

لفظ 'اردو' اپنی مختلف صورتوں میں رائج ہو چکا تھا مگر ابھی تک زبان کے معنی میں اس کا استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ جہانگیر کے وقت تک اس زبان کا نام 'ہندوی' ہی تھا۔ شاہجہاں (وفات ۱۶۶۶) نے اپنے شہر کے لیے اردوئے معلیٰ کا نام تجویز کیا۔ اس سلسلے میں میر امن کا 'باغ و بہار' میں یہ بیان قابل غور ہے:

''تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنایا تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جُدی ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔''[12]

اس وقت بھی شاعری کے لیے ریختہ کا استعمال ہی مروج تھا لیکن 'اردوئے معلیٰ' کی مخصوص اصطلاح وجود پا چکی تھی۔ بہرحال میر تقی میر (نکات الشعراء، ۱۷۵۲) اور قائم (مخزن نکات، ۱۷۵۷) نے اردوئے معلیٰ کو محاورہ کے مطابق ہی لکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''ہماری زبان کے نام کے طور پر لفظ 'اردو' کا استعمال اٹھارویں صدی کے ربع آخر کے پہلے نہیں ملتا۔ زبان کے نام کے طور پر اس لفظ (اردو) کی زندگی غالباً 'زبان اردو معلائے شاہجہاں آباد' کی شکل میں شروع ہوئی اور اس مراد تھی 'شاہجہاں آباد کے شہر معلیٰ، قلعہ معلیٰ، دربار معلیٰ کی زبان۔''[13]

علامہ قاضی نے لفظ اردو کے بارے میں نئی تحقیقاتی مواد کی بنا پر لفظ اردو کو ترکی زبان کا لفظ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''عام سندھی بول چال میں 'اردو' ڈھیر یا اشیاء کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے یہ معنی عربوں

کے سندھ میں وارد ہونے سے تین ہزار برس پہلے سے رائج ہیں، تاہم لفظ ارد، urd سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا...قدیم ناردک (Nordic) دیومالا میں لفظ 'ارد' urd یا اُرتھ urth ایک دیوی کا نام ہے۔ جو خود تقدیر ہے۔...پس ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ 'ارد' آرائی زبان کے قدیم ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آتا ہے۔ یہ آرائی تمدن کی ابتدا اور اسی خاصیت کا مظہر ہے۔ یعنی انسانی معاشرت کا یہی وہ لفظ ہے جو لفظ 'اردو' کا ماخذ ہے جس کے معنی ایسے مجمع کی زبان ہے کہ جس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوں۔''[۱۵]

اس ضمن میں ایک اور نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اردو کا لفظ دراصل لاطنی الاصل ہے یہ HORDE سے بنا ہے جس کے معنی گروہ، مجمع، لشکر اور بعض اوقات خانہ بدوش بھی ہے۔ ترکی میں یہ لفظ بعد میں پہنچا۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی تالیف 'اردوئے قدیم' میں اس لفظ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چنگیز خان اور اس کے اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کے فرد گاہوں اور لشکر گاہوں کو 'اردو' کہا کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا اور 'قراقرم' کا قدیم نام 'اردو بالیغ' تھا۔''[۱۶]

اردو کے ناموں کے سلسلے میں بیش تر محققین نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کی مناسبت سے اردو دکنی، گجری، پنجابی وغیرہ بھی کہلاتی رہی جیسا کہ شیخ بہاالدین باجن نے اپنے کلام کو 'زبان دہلوی' کہا تھا۔ بقول مولوی عبدالحق:

''یہ زبان (یعنی اردو) دکن میں آئی اور اس میں دکنی الفاظ اور لہجہ داخل ہوا تو دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی۔''[۱۷]

اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اردو کے دہلوی، گجری یا گوجری اور دکنی نام گنوانے بعد 'اردو زبان کا ارتقا' میں لکھتے ہیں:

''یہ نام اردو کو ان مقامات کے تعلق سے دیے گئے جہاں اول اول اردو کو فروغ ہوا۔''

اس طرح اردو مختلف ناموں کو پاتی ہوئی آخر میں ہماری 'اردو' ہوئی۔

حواشی:

۱۔ داغ دہلوی: کلیات داغ (گلزارِ داغ)، نئی دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۸، ص ۳۴۵۔

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی: اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱، ص ۱۲۔

۳۔ میر اثر: خواب وخیال، مرتبہ مولوی عبد الحق، پاکستان، انجمن ترقی اردو، بار دوم، ۱۹۵۰، ص ۱۱۔

۴۔ محمد حسین آزاد: آب حیات، لکھنؤ، اتر پردیس اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳، ص ۲۰۔

۵۔ جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد اول، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، طبع پنجم ۲۰۰۰، ص ۲۹۔

۶۔ محمد حسین آزاد: آب حیات، لکھنؤ، اتر پردیس اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳، ص ۷۳۔

۷۔ مصحفی: کلیات مصحفی، دیوان اول، مرتبہ نثار احمد فاروقی، دہلی، مطبع کوہ نور پرنٹنگ پرس ۱۹۶۸، ص ۱۴۵۔

۸۔ میر تقی میر: تذکرہ نکا ۃ الشعرا، مترجم حمیدہ خاتون، دہلی، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، ۱۹۹۴، ص ۱۵۸۔

۹۔ ولی: کلیات ولی، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اپریل ۲۰۰۸، ص ۱۳۳۔

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی: اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱، ص ۱۳۔

۱۱۔ حافظ محمود شیرانی: مقالات، جلد اول، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور، مجلس ترقی اردو، جنوری ۱۹۶۶، ص ۱۱۔

۱۲۔ میر امن: باغ وبہار، مرتب رشید حسن خاں، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اکتوبر ۱۹۷۰، ص ۱۴۔

۱۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی: اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱، ص ۱۶۔

۱۴۔ حافظ محمود شیرانی: مقالات، جلد اول، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، ص ۴۱۔

۱۵۔ بحوالہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ تک از سلیم اختر (علامہ قاضی: مقالہ مطبوعہ سویرا، خاص شمارہ، ۱۹۷۹، مئی) دہلی ۶، کتابی دنیا۔ ۲۰۰۵، ص ۵۷۔۵۸

۱۶۔ حکیم شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم، کراچی، جنرل پبلیشنگ ہاوس برنس روڈ، طبع دوم ۱۹۶۳، ص ۲۰۔۲۱۔

۱۷۔ مولوی عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی، انجمن ترقی اردو، طبع سوم، ۱۹۵۳۔

Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
Vol.:II, Issue:I Jan.-March 2015

شاہانہ مریم
(ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد)

حیدرآباد کی جامعات میں اردو تحقیق کی رفتار

خاتون محققین کے حوالے سے۔ایک جائزہ

Hyderabad ki jaamiaat mein Urdu tehqeeq ki raftaar (khatoon Mohqqiqeen ke Hawale se - ek jayeza by shahana maryam, Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687, Vol. II, Issue: 1, Page No. 47-59.

اردو میں تحقیق وتنقید کی ابتداء شعراء کے تذکروں اور بیاضوں سے ہوئی۔گو یہ سچ ہے کہ تذکروں اور بیاضوں میں تحقیق سے کم سروکار رکھا گیا ہے پھر بھی تذکروں کے مطالب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ گنجینہ ہیں، بیشتر کمزوریوں اور نقائص کے باوجود ان کی اہمیت وافادیت آج بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔تذکروں کے بعد مختلف کتب خانوں کی وضاحتی فہرستوں کا نمبر آتا ہے جو مختلف مستشرقین مثلاً اسپرنگر، اشپرنگر، براون، ایتھے اور ریو نے مرتب کیں۔اردو میں تحقیق کا اولین کارنامہ مشہور فرانسیسی محقق مستشرق گارساں دتاسی نے انجام دیا۔اس کے بعد عہد سرسید سے تحقیق کا باقاعدہ آغاز ہوا، خود سرسید کی تصنیفات آثارالصنادید، آئین اکبری اور ان کے رفقاء کی تدوینی، تاریخی اور سوانحی کتابوں میں ایک پختہ تحقیقی شعور ملتا ہے۔

آگے چل کر اردو ادب میں آہستہ آہستہ تحقیق کی روایت قائم ہونے لگی اور اسے فروغ ملتا گیا۔جہاں تک دکنی ادب کی تحقیق کا تعلق ہے اس میدان میں حیدرآباد کے محققین کو اولیت حاصل ہے، اردو ادب کے تحقیقی سرمایے کا بڑا حصّہ دکنی ادب کی تحقیق پر مشتمل ہے۔تحقیق کی مضبوط اور مسلسل روایت اس وقت قائم ہوئی، جب اعلیٰ جماعتوں میں اردو کو جگہ دی گئی۔یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد وہاں اردو میں تحقیقی مقالات لکھے جانے لگے۔

1884ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو یہ زبان صرف بول چال اور شعروشاعری کی محفلوں تک سجی نہیں رہی بلکہ اس نے حیرت انگیز موڑ لیا، اور حیرت انگیز ترقی کی ٹھانی ایک اردو جامعہ کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا اور اردو کی پہلی جامعہ ''جامعہ عثمانیہ'' کا قیام 1917ء کو عمل میں آیا۔یاسمین خانم اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں۔

> ''جامعہ عثمانیہ ہندوستان کی وہ واحد اور منفرد یونیورسٹی ہے جہاں ایک ہندوستانی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیاء کے پسماندہ ممالک کی جامعات میں بھی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں ایک مقامی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہو۔جامعہ نے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہے اس کی مثال سارے ہندوستاں میں کہیں نہیں ملتی۔''
>
> (شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات۔پیش لفظ۔مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔غیر مطبوعہ۔مخزونہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری۔۱۹۸۵ء۔)

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا اہم مقصد اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینا تھا۔جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اردو ادب میں تحقیق کی رفتار بھی تیز تر ہوگئی۔1923ء سے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کا آغاز ہوا۔یہ بات باعث افتخار ہے کہ ہندوستانی جامعات میں اردو تحقیق کی ابتداء جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہوئی۔آزادی سے قبل ہی جامعہ عثمانیہ میں اردو ادب میں تحقیق کی روایت قائم ہوگئی تھی۔1932ء میں جامعہ عثمانیہ میں شیخ چاند نے ''مرزا سوداؔ'' پر اپنا ایم اے کا تحقیقی مقالہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تحریر کیا۔جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو کے پہلے پروفیسر وصدر پروفیسر وحیدالدین سلیم رہے، لیکن شعبہ میں تحقیقی مقالے لکھوانے کا کام مولوی عبدالحق کے دور صدارت میں ہوا۔اس وقت تک ہندوستان کی جامعات میں پی ایچ ڈی کی روایت قائم نہیں ہوئی تھی لیکن ایم اے کی سطح پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا رواج تھا، اب یہ سلسلہ موقوف ہوگیا ہے۔ایم اے کی سطح پر تحقیقی مقالات لکھنے کا سلسلہ 1932ء سے 1949ء تک اور پھر 1965ء سے 1976ء تک جاری رہا۔1976ء سے جامعہ میں ایم فل کا نیا کورس شروع کیا گیا۔جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی میں تحقیق کی ابتداء 1940ء سے ہوئی۔سب سے پہلا پی ایچ ڈی کا مقالہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے داخل کیا لیکن ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو شعبۂ اردو کی پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی۔جامعہ عثمانیہ

میں سندی تحقیق کے لئے جن جن موضوعات پر مقالے لکھے گئے ان میں زیادہ تر مقالے نہایت اہم اور قابل قدر موضوعات پر ہیں، جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مقالات کے موضوعات پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنی کتاب ''حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق'' میں رقم طراز ہیں:

''اردو زبان وادب کا کوئی موضوع یہاں تحقیق کی نظروں سے اوجھل ہیں رہا، قدیم ادب کے ساتھ ساتھ جدید ادب کی مختلف اصناف کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا گیا... تدوین کے بھی بے شمار کام انجام دئے گئے، لسانیات ہو کہ ادب کی مختلف اصناف، ادبی اشخاص پر تحقیق ہو کہ ادبی تاریخیں ان سب پر محققین نے کافی تلاش وجستجو کی اور کئی پنہاں گوشوں کو منظر عام پر لے آئے''۔

(حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق، دہلی، 2010ء ۔ص۔93)

یہ بات نہایت ہی حیرت افروز اور مسرت بخش ہے کہ حیدرآباد کی جامعات میں مرد محققوں کی بہ نسبت خاتون محققین کی تعداد زیادہ ہے۔

شہر حیدرآباد کی دوسری اہم جامعہ یونیورسٹی آف حیدرآباد ہے۔ اس مرکزی جامعہ ''یونیورسٹی آف حیدرآباد'' کا قیام 2 اکتوبر 1974ء کو عمل میں آیا۔ شعبہ اردو کا قیام 1979ء میں ہوا۔ شعبہ اردو میں سب سے پہلے بہ حیثیت ریڈر ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا تقرر ہوا۔ شعبہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی میں تحقیق کا کام 1980ء سے شروع ہوا۔ شعبہ میں پہلی ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے والی محقق محترمہ اودھیش رانی ہیں، جنھیں 1982ء میں ایم فل کی سند دی گئی۔ پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے خوش قسمت اسکالر ڈاکٹر محمد انور الدین ہیں، جنھیں دسمبر 1984ء میں پہلی پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی۔ شعبہ کے ایک اور اسکالر میر محبوب حسین نے سب سے پہلے شعبہ میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ داخل کیا تھا، لیکن بدقسمتی سے یہ اعزاز ڈاکٹر محمد انور الدین کے حصّہ میں آیا۔

حیدرآباد یونیورسٹی میں قدیم ادب، جدید ادب، دکنیات، فکشن، تدوین، ترتیب، اشاریہ جات، صحافت، فلم، میڈیا، علاقائی ادب، جیسے موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے، اس کے علاوہ تقابلی مطالعے، علاقائی ادب، اور شعری اصناف پر بہت کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ قدیم دکنی ادب کے مخطوطات و دواوین کی تدوین کا کام قابل تعریف ہے۔ حیدرآباد یونیورسٹی میں زیادہ تر تحقیقی مقالات کا کام شخصیات پر ہوا ہے۔ ہندوستانی جامعات میں حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبہء اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں پر اردو میں تحقیق کی رفتار نہایت ہی تیز ہے، اپنے قیام کے تیس (30) سالہ تحقیقی سفر میں پانچ سو سے زائد تحقیقی مقالات قلمبند ہوئے ہیں۔ مقالہ نگاروں میں اکثریت خاتون محققین کی ہے۔

حیدرآباد کی تیسری اہم جامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہے۔ جسے حیدرآباد کی دوسری اہم مرکزی جامعہ اور آزادی کے بعد ہندوستان کی پہلی اردو یونیورسٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جس کا قیام پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت 1998ء کو عمل میں لایا گیا۔ جہاں شعبہ اردو میں تحقیق کی ابتداء 2006ء سے ہوئی، ایم فل کی ڈگری کے لئے دو مقالے 2007ء میں داخل کئے گئے۔ جنھیں 2008ء میں ایم فل کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر محمد الطاف، ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھیں جامعہ اردو کی پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگ حاصل کرنے اور شعبہ اردو کے پہلے ڈاکٹر بننے کا اعزاز حاصل ہوا، انھوں نے 2010ء میں اپنا مقالہ داخل کیا اور 2011ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی۔

اردو یونیورسٹی میں تحقیق کی رفتار اطمنان بخش ہے۔ شعبہ کے قیام کے چند سالوں میں ہی تحقیقی کاموں کی رفتار نہایت تسلی بخش رہی ہیں، یہاں پر لکھے گئے تحقیقی مقالات کے موضوعات میں دکنیات، فکشن، جدید ادب، تنقید، صحافت، تقابلی مطالعے، علاقائی ادب، اشاریہ جات، جیسے معیاری موضوعات شامل ہیں۔ حیدرآباد کی دوسری جامعات (جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد یونیورسٹی) کے تحقیقی مقالات کے موضوعات سے یہاں کے موضوعات کا تقابل کرنے پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس یونیورسٹی میں شخصیات پر تحقیقی مقالے نہیں لکھوائے گئے، اور نہ ہی یہاں اس کا رواج قائم کرنا چاہتے ہیں، جو نہایت ہی قابل تحسین ہیں۔

حیدرآباد کی مختلف جامعات کے شعبہائے اردو میں ابتداء سے ۲۰۱۰ء تک جو تحقیقی مقالے خواتین محققین نے قلمبند کیے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی ایم۔فل کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
1	پون کماری	راجہ گردھاری پرشاد باقی اور ان کے خاندان کی ادبی خدمات	1976
2	صالحہ بیگم	دیوان قیس کی تنقیدی تدوین	1978
3	لئیق خدیجہ	میر شمس الدین فیض: حیات اور کارنامے	1978
4	سیدہ عزت النساء بیگم	دکنی نورناموں کا تنقیدی مطالعہ	1978

5	عابدالنساء	آل احمد سرور کی ادبی خدمات	1978
6	فاطمہ بیگم	سترہویں صدی کی دکنی شاعری میں ہندوستانی عناصر	1979
7	زہرا عزیز	اردو نثر کی ترقی میں جامعہ عثمانیہ کا حصہ	1979
8	یوسف النساء	حیدرآباد میں اردو ناول کا ارتقاء	1980
9	آمنہ سلطانہ	دکنی طوطی ناموں کا تنقیدی مطالعہ	1980
10	جیلانی بیگم	اٹھارویں صدی میں شعرائے دہلی پر شعرائے دکن کے اثرات	1980
11	غوثیہ بیگم	کرشن چندر کے ناولوں اور افسانوں میں انسانی اقدار	1980
12	جہاں بانو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین حیات اور ادبی خدمات	1980
13	فرحت رخسانہ	شمالی ہند کے شعراء کا دکنی شعراء کا پر اثر	1980
14	دردانہ بیگم	خلیل الرحمٰن آعظمی: حیات اور ادبی کارنامے	1981
15	فریدہ بیگم	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی: شخصیت اور کارنامے	1981
16	افضل شاہانہ	اردو ادبی لغات ایک جائزہ	1981
17	میمونہ بیگم	پطرس بخاری: حیات اور کارنامے	1981
18	عطیہ سلطانہ	اردو یونیورسٹی کا تصور اور جامعہ عثمانیہ کا قیام	1982
19	یاسمین خان	پریم چند کے ناولوں میں اخلاقی اقدار	1982
20	کوکب النساء بیگم	تبید النساء کی تنقیدی تصنیف	1983
21	اقبال بیگم	بانو طاہرہ سعید: حیات اور کارنامے	1983
22	مہر سلطانہ افشاں	معتبر خاں عمر اورنگ آبادی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کی تنقیدی تدوین سنہ تصنیف سنہ ۱۱۰۰ھ/1686ء	1983
23	آمنہ خاتون	ہاشمی بیجاپوری: حیات اور کارنامے	1984
24	عطیہ سلطانہ	اردو مختصر افسانے میں تہذیبی عناصر	2000
25	نفیس عائشہ	راجندر سنگھ بیدی کے فکشن میں نسوانی کردار	2004
26	عرشیہ آفرین	فسانہ آزاد کا تنقیدی مطالعہ	2005
27	زرینہ عباسی	پروفیسر حبیب ضیاء بحیثیت مزاح نگار	2004
28	حمیدہ بیگم	صغرا ہمایوں مرزا بحیثیت ناول نگار	2008
29	عذرا تسلیم	آزادی کے بعد حیدرآبادی مصنفین کی خاکہ نگاری	جاری...
30	عظمت فاطمہ	علی سردار جعفری بہ حیثیت نثر نگار	2004
31	نصرت سلطانہ	عفت موہانی حیات اور کارنامے	2004
32	ریحانہ سلطانہ	شفیق فاطمہ شعری کا اردو کی جدید شاعری میں حصہّ	2004
33	نوشینہ شازلی	ساگر سرحدی کی ڈرامہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ	2004
34	صبیہ فاطمہ	رفیعہ منظور الامین کی افسانہ نگاری کا جائزہ	2004
35	میمونہ بیگم	حیدرآباد میں اردو افسانہ نگاری کا ارتقاء	2005
36	انجم النساء بیگم	اردو زبان وادب اور کمپیوٹر	2006
37	رفعت سلطانہ	اردو میں کرداری افسانہ	2007
38	انیس سلطانہ	حیدرآباد میں اردو ڈرامہ آزادی کے بعد	2007

39	اختر سلطانہ	اردو افسانہ 1970ء کے بعد	2007
40	نسیم النساء	حیدرآبادی میں نوحہ نگاری 1950ء کے بعد	2007
41	نوری خاتوں	نسیمہ تراب الحسن حیات شخصیت اور ادبی کارنامے	2008
42	تاج النساء	ڈاکٹر حبیب ضیاء کی حیات اور ادبی کارنامے	2007
43	ممتاز جہاں	اعظم صوفی حیات اور کارنامے	2009
44	رئیسہ سلطانہ	منوہر راج سکسنیہ کی ادبی خدمات	2009
45	صبیحہ محمدی	فضل الرحمٰن کی ڈرامہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	2009
46	سیدہ نسیم سلطانہ	خواتین کی احتجاجی شاعری	2009
47	افروز پروین	امنہ ابوالحسن کی افسانہ نگاری	2009
48	ام ریحانہ کوثر روبی	یٰسن احمد کی افسانہ نگاری کا جائزہ	جاری...

پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
49	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر کا ارتقاء	1954
50	ڈاکٹر خالدہ یوسف	اورنگ آباد میں اردو ادب کا ارتقاء	1959
51	ڈاکٹر سیدہ جعفر	اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقاء	1959
52	ڈاکٹر ثمینہ شوکت	مہاراجہ چندولعل شاداں: حیات اور شاعری اور شعراء کی سرپرستی	1960
52	ڈاکٹر رشید موسوی	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	1963
54	ڈاکٹر حبیب ضیاء	مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ: حیات اور ادبی خدمات	1966
55	ڈاکٹر مہر النساء	دکنی اردو کا آغاز وارتقاء	1966
56	ڈاکٹر اشرف رفیع	نظم طباطبائی: حیات اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ	1969
57	ڈاکٹر حمیرا جلیلی	سب رس کی تنقیدی تدوین	1973
58	ڈاکٹر زینت ساجدہ	نوسرہار کی تنقیدی تدوین	1973
59	ڈاکٹر سلمی بلگرامی	سجاد حیدر یلدرم شخصیت اور فن	1974
60	ڈاکٹر فرزانہ بیگم	دکنی کی نثری داستانیں	1974
61	ڈاکٹر صابرہ سعید	اردو ادب میں خاکہ نگاری	1975
62	ڈاکٹر محمدی بیگم	احسن الدین خان بیانؔ حیات اور کلام	1976
63	ڈاکٹر رضیہ صدیقی	دیوان سلطان کی تنقیدی ترتیب وتدوین	1979
64	ڈاکٹر مہر جہاں	اسد علی خان تمنا: حیات اور ادبی کارنامے	1979
65	ڈاکٹر رفعت سلطانہ	فراقؔ کی غزل گوئی کے اہم رجحانات	1981
66	ڈاکٹر لئیق صلاح	عہد ارسطو جاہ کی علمی وادبی خدمات	1983
67	ڈاکٹر سید عزت النساء	اردو سفرنامے	1983
68	ڈاکٹر جیلانی بیگم	اٹھارویں صدی عیسویں میں شمالی ہند کی ادبی زبان	1984
69	ڈاکٹر میمونہ بانو	پروفیسر عبدالقادر سروری حیات اور کارنامے	1984
70	ڈاکٹر یوسف النساء	عشرتیؔ کی مثنوی نہہ درپن کی تدوین	1985

71	ڈاکٹر یاسمین خانم	شعبہء اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو خدمات	1986
72	ڈاکٹر میمونہ وحید	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی حیات اور کارنامے	1987
73	ڈاکٹر فاطمہ پروین	غواصی حیات اور کارنامے	1989
74	ڈاکٹر عطیہ سلطانہ	دیوان غواصی کی تنقیدی تدوین	1989
75	ڈاکٹر سعیدہ بیگم	مثنوی لعل وگوہر کی تنقیدی تدوین	1989
76	ڈاکٹر شاہانہ امیر	عبادت بریلوی: حیات اور کارنامے	1990
77	ڈاکٹر کوکب النساء	فراقی بیجاپوری اور ان کی مثنوی ''مراۃ الحشر'' کی تدوین	1990
78	ڈاکٹر عابدالنساء	اردو میں تحقیق 1900ء تا 1980ء	1991
79	ڈاکٹر قمر سلطانہ	اردو تحقیق اور قاضی عبدالودود	1991
80	ڈاکٹر بدر سلطانہ	وحیدالدین سلیم کی نثری خدمات کا تنقیدی جائزہ	1992
81	ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ	مسعود حسین خان کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	1992
82	ڈاکٹر فریدہ وقار	پروفیسر گیان چند جین کی ادبی خدمات	1993
83	ڈاکٹر عالیہ خانم	تدوین تاریخ ادب اردو کا ارتقاء ایک تنقیدی جائزہ	1994
84	ڈاکٹر معصومہ بیگم	ٹیگور کا اثر اردو ادب پر	1995
85	ڈاکٹر رفعت سلطانہ	دیوان صفا کی تنقیدی تدوین	1995
86	ڈاکٹر شفیعہ قادری	اردو تحریک آزادی سے قبل	1997
87	ڈاکٹر واجدہ فرزانہ	دکنی مثنویوں میں ثقافتی اور تہذیبی عناصر	1998
88	ڈاکٹر عسکری صفدر	عابد مرزا بیگم وبیغم کے کلیاتِ گنجینہ ریختی کی تنقیدی تدوین	1998
89	ڈاکٹر فاطمہ آصف	مولوی نصیرالدین ہاشمی بحیثیت محقق	1999
90	ڈاکٹر نصرت پروین	قطب شاہی مثنویوں میں تصوف کے رجحانات	1999
91	ڈاکٹر سیدہ انجم سلطانہ	بیسویں صدی میں اردو غزل میں علامت نگاری	2000
92	ڈاکٹر امتہ الکریم طلعت صدیقہ	اردو خاکہ نگاری	2003
93	ڈاکٹر صالحہ شاہین	اردو میں تبصرہ نگاری	2003
94	ڈاکٹر غوثیہ بیگم	عتیق شاہ حیات اور کارنامے	2003
95	ڈاکٹر مسلم خاتون	علامہ راشد الخیری شخصیت اور فن	2003
96	ڈاکٹر سیدہ خالدہ عشرت	آزادی کے بعد حیدرآباد میں اردو شاعرات	2004
97	ڈاکٹر خورشید فرزانہ	ڈاکٹر رفعیہ سلطانہ بحیثیت افسانہ نگار	2004
98	ڈاکٹر فردوس جہاں	وزیر حسن بحیثیت افسانہ نگار	2004
99	ڈاکٹر انیس فاطمہ	بشیرالنساء بشیر حیات اور کارنامے	2004
100	اقبال بیگم	خانوادۂ سالار جنگ کی ادبی سرپرستی	جاری....
101	ڈاکٹر ہاجرہ کوثر	اردو میں تقریظ نگاری	2004
102	ڈاکٹر نوری خاتون	نسیمہ تراب الحسن: حیات شخصیت اور ادبی کارنامے	2008
103	ڈاکٹر کے امتہ الرحیم	مولانا باقر آگاہ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کی تنقیدی تدوین	2008
104	ڈاکٹر تبسم آرا	یوسف سرمست: بحیثیت نقاد	2002

105	ڈاکٹر نجم النساء	آزادی کے بعد حیدرآباد کی خواتین نثر نگار	2008
106	ڈاکٹر شابانہ بیگم	قطب سرشار حیات اور کارنامے	2008
107	ڈاکٹر واجدہ بانو	عچیہ پروین بحیثیت کہانی نگار	2008
108	ڈاکٹر مہر النساء	علی باقر کی افسانہ نگاری	2009
109	ڈاکٹر عطیہ سلطانہ	فلمی شاعری کے ذریعہ شعری اصناف کا فروغ	2010
110	ڈاکٹر عائشہ بیگم	حیدرآباد میں نعتیہ شاعری آزادی کے بعد	2009
111	ڈاکٹر میمونہ بیگم	اردو افسانے کو رضا الجبار کی دین	2009
112	سائرہ عاصم جہاں	اردو ادب میں پرویز یداللہ مہدی کا حصہ	جاری....
113	تاج النساء	ہندوستان کی خاتون ناول نگاروں کے ناولوں میں سماجی وتہذیبی اثرات	جاری....
114	افسری بیگم	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: حیات اور کارنامے	جاری....
115	حمیرا فاطمہ	محمد علی اثر: شخصیت اور کارنامے	جاری....
116	شاہدہ بیگم	پروفیسر رحمت یوسف زئی: حیات اور کارنامے	جاری....

حیدرآباد یونیورسٹی ایم۔فل کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
1	اودھیش رانی	اردو تلگو مختصر افسانہ 1907ء تا 1936ء تقابلی مطالعہ	1982
2	سیدہ قادر فرزانہ	قاضی عبدالغفار: حیات اور کارنامے	1982
3	رفیعہ قادری	تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعوں کا اشاریہ	1982
4	قمر سلطانہ	جمیل مظہری: حیات اور کارنامے	1982
5	شفیعہ قادری	حیدرآباد کے اردو اداروں کے ادبی خدمات	1982
6	انیسہ سلطانہ	حیدرآباد میں طنز ومزاح کا نشوونما	1982
7	ظہیرہ سلطانہ	نگار (ببلوگرافی) اور خالق نگار	1982
8	شاہانہ امیر	میر محبوب علی خان	1993
9	محمدی سلطانہ	دکن میں اردو ڈرامہ	1993
10	واجدہ فرزانہ	نصیرالدین ہاشمی: حیات اور کارنامے	1993
11	ممتاز سلطانہ	جیلانی بانو: حیات اور کارنامے	1984
12	سیدہ وہاب النساء	شاہد صدیقی: حیات اور کارنامے	1984
13	عائشہ خاتون	اردو غزل کے معروف اشعار کی تحقیق وتصحیح	1984
14	بشیر النساء بیگم	جوشؔ بحیثیت غزل گو شاعر	1984
15	مکرم النساء	1857ء اور اردو نثر	1985
16	تنویر جہاں	پروفیسر سید محمد: حیات اور کارنامے	1985
17	لئیق فاطمہ	مرزا ظفر الحسن: حیات اور کارنامے	1986
18	صبیحہ نسرین	حضرت محمدؐ سے متعلق دکنی مثنویات	1985
19	خسرو جہاں	شیخ چاند: حیات اور کارنامے	1987
20	نور النساء	شاذ تمکنت: حیات اور کارنامے	1987

21	سیدالنساءبیگم	ڈاکٹر حفیظ قتیل: حیات اور کارنامے	1987
22	آسیہ بانو	ناصر کاظمی: حیات اور کارنامے	1987
23	نوید ثمینہ	اردو میں احتجاجی شاعری 1900ء سے تا حال	1988
24	رفعت سلطانہ	زینت ساجدہ: شخصیت اور محاکمہ	1989
25	عابدالنساء	استعارہ اور علامت کے نظریات کے متعلق، اور ان کا باہمی رشتہ	1988
26	اطہر سلطانہ	وحید اختر: شخص اور شاعر	1989
27	غوثیہ سلطانہ	اردو ناول کا ارتقاء (ابتداء سے 1900ء تک)	1990
28	عفت یاسمین	آزادی کے بعد حیدرآباد کی خواتین افسانہ نگار	1989
29	شوکت سلطانہ	صغرا ہمایوں مرزا: حیات اور کارنامے	1989
30	سیدہ زہرہ بیگم	حیدرآباد میں مرثیہ نگاری آزادی کے بعد	1989
31	رفعت سیما خاتون	اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ	1990
32	رضیہ سلطانہ	اقبال کی اردو شاعری میں عورت کا مقام	1991
33	طلعت جہاں	شعراء کی منظوم تنقیدیں	1990
34	انیس فاطمہ	شرر اور حیدرآباد	1992
35	تسنیم فاطمہ	اردو میں خواتین کے رسائل 1947ء تک	1991
36	عشرت فاطمہ سروری	رسالہ ''شب خون'' کا تجزیاتی و وضاحتی اشاریہ	1992
37	نکہت جہاں	اردو شاعری میں فیمنزم	1991
38	سراج النساء	شیخ حافظ دہلوی۔ شخص اور شاعر	1992
39	سیدہ کاظم سلطانہ	ریاست حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی خدمات	1991
40	امتہ الرحیم	عزیز باغ کی اردو خدمات	1992
41	شاہدہ سلطانہ	سید منہاج الدین شخصیت، حیات اور ادبی خدمات	1992
42	سیدہ اسریٰ	پریم چند کے افسانوں میں علامت نگاری	1993
43	صالحہ سعید	آزادی کے بعد اردو میں خواتین کے رسائل	1994
44	دردانہ شاہین	حیدرآباد کے کتب خانوں میں مخزونہ اردو تذکرہ	1994
45	رضوانہ	بیدی کے افسانوں میں نسوانی کردار	1994
46	شہمین بانو قریشی	رسالہ سب رس آف کراچی کا اشاریہ	1992
47	نکہت آرا شاہین	عصمت چغتائی کے ناولوں میں عورتوں کے مسائل	1995
48	عصمت النساء	اردو ناول ترقی پسند تحریک سے قبل	1994
49	معراج سلطانہ	تاج مہجور۔ شخص اور شاعر	1996
50	سید منیر سلطانہ	تنویر احمد علوی: حیات اور ادبی کارنامے	1996
51	صالحہ شاہین	کنول پرشار کنول: حیات اور کارنامے	1996
52	گل رعنا	حیدرآباد میں اردو خاکہ نگاری 1947ء کے بعد	1997
53	عاقلہ بیگم	مرزا شکور بیگ۔ شخصیت اور ادبی کارنامے	1997
54	زاہدہ بیگم	شفیع الدین نیّر بحیثیت بچوں کے ادیب	1997
55	نرگس گلنار	مولوی عبدالحق کی مکتوب نگاری	1997

56	رقیہ سلطانہ	خیرات ندیم۔شخص اور شاعر	1998
57	نکہت عائشہ	مرزا سردار علی بیگ کی علمی وادبی خدمات	1996
58	میمونہ شاہ بانو	مولانا سید شاہ عبدالحسن ادیب۔حیات اور ادبی خدمات	1997
59	ذکیہ سلطانہ	بیسویں صدی کے اوائل میں بچوں کا ادب 1900ء سے 1920ء تک	1996
60	نکہت سلطانہ	ریاض خیرآبادی کی ادبی وصحافتی خدمات	1998
61	جمیل فاطمہ	ڈاکٹر حبیب ضیاء۔شخصیت اور فن	1997
62	شہمین سلطانہ	بچوں کے ادب میں افسر میرٹھی کا حصہ	1997
63	تسنیم سلطانہ	رفیعہ منظورالامین کی افسانہ نگاری	1997
64	شائستہ رفعت	دکنی شاعری کے فروغ میں علی صاحب میاں کا حصہ	1998
65	قدیرالنساء	عفت موہانی بحیثیت ناول نگار	1998
66	شاہدہ بیگم	حیدرآباد میں اردو تحریک اور حبیب الرحمٰن	1999
67	تبسم آرا بیگم	حیدرآباد کے اردو ترقی پسند شعراء 1960ء تک	1997
68	اُم عذرا بیگم	حیدرآباد میں جدید اردو افسانہ 1960ء کے بعد	1997
69	اُم حبیبہ	صفدر حسین ۔شخصیت اور فن	1998
70	ناظمہ نسرین	رسالہ اردو کی ادبی خدمات	1998
71	شاہدہ تسنیم	ڈاکٹر رشید موسوی اور ان کی ادبی خدمات	1998
72	شاذیہ تمکنت	محمد عبدالرزاق خان صولت: حیات اور کارنامے	1999
73	عائشہ مقصود	مولوی محمد اکبر علی بہ حیثیت صحافی	2000
74	عرشیہ جبین	تہنیت النساء زور اور ان کی نعتیہ شاعری	1998
75	عاقلہ سلطانہ	مصیح انجم۔بہ حیثیت مزاح نگار	1999
76	نکہت سلطانہ	آمنہ محمد ابوالحسن کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	2000
77	آمنہ تحسین	ڈاکٹر زور بحیثیت افسانہ نگار	2001
78	رضوانہ بیگم	غلام جیلانی ۔شخصیت اور فن	1999
79	تبسم سلطانہ	ضلع نظام آباد کے شعروادب کا جائزہ	2000
80	نجم النساء بیگم	نجمہ نکہت: حیات اور کارنامے	2000
81	راعنا سلیم	نصیرالدین ہاشمی کے کتابوں کی وضاحتی فہرست	2001
82	اسریٰ طیبہ	رئیس اختر فن اور شخصیت	2001
83	ایچ۔انیس فاطمہ	ناصر کرنولی کی علمی وادبی خدمات	2001
84	عمرانہ سراج	منشی فیاض علی کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ	2001
85	رفیعہ بیگم	فضل الرحمٰن۔بحیثیت ڈرامہ نگار	2001
86	زہرہ جبین	جدید ادب، رجحانات کے فروغ میں رسالہ شعروحکمت کا حصہ	2001
87	عالیہ تسنیم	ڈاکٹر صادق نقوی بحیثیت ادیب وشاعر	2001
88	ایچ۔رئیس فاطمہ	سخاوت مرزا۔بحیثیت دکنی محقق	2002
89	نشاط تہنیت تمکین	پروفیسر لئیق صلاح کے علمی وادبی خدمات	2002
90	مبینہ متین	عبدالمجید صدیقی کے علمی وادبی کارناموں کا جائزہ	2002

91	مسرت جہاں	قمر رئیس کے خدمات: ترقی پسند تحریک کے حوالے سے	2002
92	بدر رضوانہ	اوپندناتھ اشک بحیثیت افسانہ نگار	2002
93	نفیس نازنین	سدرشن کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	2002
94	نسیم سلطانہ	اقبال اکادمی حیدرآباد کے علمی خدمات	2003
95	فائزہ ناہید	سوغات (دورسوم) کا وضاحتی اشاریہ	2003
96	عائشہ صدیقہ	برق یوسفی: شخص اور شاعر	2002
97	عائشہ فاطمہ	ڈاکٹر سعید عبدالمنان کے علمی وادبی خدمات	2002
98	ساجدہ بیگم	شاہ گلی ادیب بحیثیت شاعر	2002
99	سعیدہ	اختر حسن :حیات اور کارنامے	2003
100	رفعت النساء	دکنی میں طنز ومزاح، محمد حمایت اللہ کے حوالے سے	2003
101	سیدہ عمرانہ	یوسف کمال کے علمی وادبی خدمات	2003
102	تہنیت جبین	عزیز احمد جلیلی کے تحریروں کا تنقیدی جائزہ	2003
103	حمیرا تسلیم	ریاست علی تاج: حیات اور کارنامے	2003
104	صبیحہ سلطانہ	رؤف خیر۔شخصیت اور فن	2003
105	نسیم سلطانہ	فاطمہ تاج کے نثری وشعری خدمات	2003
106	سیدہ فاطمہ سعدیہ	جدید اردو افسانہ کے فروغ میں حیدرآباد کا حصہ	2004
107	شیخ واجدہ تبسم	عصمت جاوید کے علمی وادبی خدمات	2004
108	ثمینہ نکہت فاطمہ	صغریٰ عالم فن اور شخصیت	2004
109	عرفانہ تسنیم	کرشن پرشاد کول کے علمی وادبی خدمات	2004
110	حمیرا تزئین	آخری شب کے ہمسفر کا تنقیدی مطالعہ	2004
111	بی بی شبانہ	ابواولاغلام مصطفیٰ عاشقی بحیثیت نعت گو	2004
112	احمدی بیگم	عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ ناول	2004
113	تحسین سلطانہ	فریدہ زین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	2004
114	اسما ناہید	انتظار حسین کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ	2004
115	سیدہ عرشیہ عمرانہ	نورالدین خان کے علمی وتحقیقی خدمات کا تنقیدی جائزہ	2005
116	تہمینہ نسرین	رامن راج سکسینہ۔شخصیت اور کارنامے	2005
117	فرزانہ بیگم	رسالہ ''کتاب نما'' کا وضاحتی اشاریہ	2005
118	عشرت سلطانہ	خواتین کے ادب کے فروغ میں شباب ناہید کا حصہ	2004
119	خضریٰ بیگم	انور راشد کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	2005
120	لئیق النساء	معلم نسواں کا وضاحتی اشاریہ	2005
121	اسریٰ نوید	انیس فاروقی کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	2006
122	ریشمہ خانم	رسالہ ''زیب النساء'' کا وضاحتی اشاریہ	2007
123	عالیہ مقصود	عوض سعید۔بحیثیت خاکہ نگار	2005
124	سیدہ بلقیس صبیحہ	خانوادے لاادبالی کے وابستہ ادیب وشعراء	2007
125	صدیقہ سلطانہ	ڈاکٹر عابد معزیز۔بحیثیت طنز ومزاح نگار	2006
126	نسرین بانو	فاطمہ عالم علی خان کی علمی وادبی خدمات	2006

127	سیدہ شہناز رضوی	رسالہ ''ساقی'' دہلی کا وضاحتی اشاریہ	2006
128	افسر بدر	اقبالیات کے فروغ میں سید مصلح الدین سعدی کا حصہ	2006
129	رفعیہ سلطانہ	عزیز النساء صبا کے علمی وادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	2007
130	آمنہ نصرت	طنز ومزاح کے فروغ میں سرور ڈنڈا کا حصہ	2006
131	اقبال فاطمہ	سید اختر زیدی شخصیت اور ادبی خدمات	2006
132	زرینہ خانم	راجندر سنگھ بیدی کے فکشن کا نفسیاتی مطالعہ	2007
133	ظفر آمنہ	اردو ریسرچ سنٹر میں مخزونہ رسال ''زیب النساء'' کا اشاریہ	2006
134	تحسین النساء بیگم	حامد اکمل کے ادبی خدمات	2006
135	عطیہ بیگم	تنہا تماپوری: شخصیت اور فن	2007
136	شیخہ زبیدہ	ڈاکٹر جمال شریف کے دکنی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	
137	نثار سلطانہ	امراؤ جان ادا میں لکھنو تہذیب کے نقوش	2007
138	غوثیہ بانو	منظور الامین کے علمی وادبی اور میڈیائی خدمات	2006
139	آمنہ بیگم	اردو میں منی منی افسانہ۔ تحقیقی وتنقیدی جائزہ	2008
140	نصرت بیگم	نذیر احمد کے ناولوں میں تہذیبی تصادم	2009
141	تسلیم بیگم	حمید سہروردی کی شاعری کا فنی اور تنقیدی جائزہ	2008
142	اسماء فاطمہ	ڈاکٹر میمونہ دہلوی کے علمی وادبی خدمات کا جائزہ	2008
143	سیدہ ناصرہ جبین	پریم چند کے افسانوں میں ذات پات کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ	2008
144	احمدی فاطمہ	علاء الدین نوید: شخص اور شاعر	2008
145	شاہین	رسالہ ''حسن اور حسن کار'' کا وضاحتی اشاریہ	2009
146	ناظمہ بیگم	محافظ حیدر بحیثیت افسانہ نگار	2008
147	رئیس سلطانہ	عبدالصمد کا ناول ''دوگز زمین'' کا فنی جہت	2008
148	شاکرہ بیگم	سرفراز حسین اعظمی کے ناول ''شاہد رعنا'' کا تنقیدی جائزہ	2008
149	سیدہ شفیقہ سلطانہ	ڈاکٹر محمد علی اثر بہ حیثیت شاعر	2008
150	نشاط بیگم	مرزا مصطفیٰ علی بیگ۔ بحیثیت مزاح نگار	2009
151	صالحہ بیگم	فقیر اللہ شاہ حیدر کی مثنوی ''تناولی'' کا تنقیدی وتہذیبی مطالعہ	2009
152	رضوانہ	خانوادہ منجو قمر کی ادبی خدمات	2009
153	شیخ عائشہ	رسالہ ''مخزن'' کا وضاحتی اشاریہ	2009
154	انجم فاطمہ	مثنوی ''نظم انور'' کی تدوین وتنقید	2009
155	امتیاز فاطمہ	مثنوی چندر بدن ومہیار کی تدوین وتنقید	2009
156	فرید النساء بیگم	غیاث متین: شخص وشاعر	2009
157	راحلہ عشرت	جدید اردو غزل کا استعاراتی مطالعہ 1960ء سے 1970ء تک	2009
158	فہمیدہ بیگم	گلدستہ فیض کا تنقیدی مطالعہ	2009
159	اسماء فضیلت	نصیر احمد نصیر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	2009
160	شکیب بانو	مرغوب الطبع کی تدوین	2010
161	حنا کوثر	حسین الحق کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ	2010

162	نور جہاں ایس	ضلع کرنول میں اردو تعلیم وتدریس کے مسائل	2010
163	فریدہ تبسم	محمد زماں آزردہ شخصیت اور انشائیہ نگاری	2010
164	فاریہ امام	1960ء کے بعد ناولوں میں حیدرآبادی تہذیبی عناصر	2010
165	وسیم بیگم	گلی نلکنڈوی بحیثیت مزاح نگار	2010
166	آصفہ شمیم	شمیم نکہت کی علمی وادبی خدمات	2010
167	روحینہ فاطمہ	رسالہ شاعر مشمولہ افسانوں کا تنقیدی جائزہ: 1960ء تا 1970ء	2011
168	عائشہ	رسالہ سب رس مشمولہ افسانوں کا تنقیدی جائزہ: 1960ء تا 1970ء	2010
169	ممتاز بیگم	ناول آنگن کا تجزیاتی مطالعہ	2010
170	شاہانہ بیگم (شاہانہ مریم شان)	ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق	2010

پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
171	ڈاکٹر اختر سلطانہ	قرۃ العین حیدر حیات اور کارنامے	1986
172	ڈاکٹر شہناز بیگم	میر عثمان علی خان: حیات اور ادبی کارنامے	1987
174	ڈاکٹر اودھیش رانی	دکنی پر دیگر ہندوستانی زبانوں کا اثر	1987
175	ڈاکٹر بشیر النساء بیگم	اردو شاعری شخصی مرثیہ	1993
176	ڈاکٹر صبیحہ نسرین	شاہ میراں جی شمس العشاق: حیات اور کارنامے	1993
177	ڈاکٹر سعید النساء بیگم	اوپندر ناتھ اشک: حیات اور ان کے ناول	1994
178	ڈاکٹر سعیدہ زہرا بیگم	اردو میں سلام گوئی کی روایت	1995
179	ڈاکٹر غوثیہ سلطانہ	دکنی کی نعتیہ شاعری	1998
180	ڈاکٹر اطہر سلطانہ	وحید اختر فن اور فنکار	1994
181	ڈاکٹر طلعت جہاں	اردو مرثیہ آزادی کے بعد: ہندوستان میں	1996
182	ڈاکٹر نکہت جہاں	اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات	1995
183	ڈاکٹر انیس فاطمہ	اردو میں نظم نگاری 1960ء کے بعد	2000
184	ڈاکٹر رضوانہ	اردو زبان پر عربی کے لسانی اثرات	1997
185	ڈاکٹر سیدہ حشمت النساء	مائل حیدرآبادی: حیات اور کارنامے	2004
186	ڈاکٹر ذکیہ سلطانہ	بیسویں صدی میں اردو رسائل 1900ء تک	2001
187	ڈاکٹر عرشیہ جبین	شارب ردولوی بہ حیثیت نقاد	2003
188	ڈاکٹر شاہدہ تسنیم	مغنی تبسم حیات اور علمی وادبی کارنامے	2003
189	ڈاکٹر آمنہ تحسین	حیدرآباد میں اردو تحقیق 1947ء سے قبل	2003
190	مبینہ متین	اصناف ادب اردو کا تحقیقی وتجزیاتی جائزہ	
191	ڈاکٹر مسرت جہاں	قمر رئیس کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ	2004
192	رفیعہ بیگم	رضاء الجبار: شخصیت اور فن	2011
193	ڈاکٹر عائشہ صدیقہ	رحمٰن جامی کی شاعری میں فنی وحیاتی تجزیہ: ایک تنقیدی مطالعہ	2005
194	ڈاکٹر ثمینہ سلطانہ	اردو فکشن کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ	2006

195	رفعت النساء	غلام دستگیر رشید بحیثیت اقبال شناس	2010
196	سیدہ فاطمہ	مالک رام بحیثیت ماہر غالبیات	جاری.....
197	عرفانہ تسنیم	نثار احمد فاروقی کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
198	ثمینہ نکہت فاطمہ	ڈاکٹر افضل الدین اقبال کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
199	احمدی بیگم	دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے مترجمہ کتابوں کا وضاحتی اشاریہ	جاری.....
200	ساجدہ بیگم	حیدرآباد میں اردو خاکہ نگاری کا آغاز وارتقاء	جاری.....
201	ایس۔واجدہ تبسم	برصغیر کے اردو ناولوں میں تحلیل نفسی	جاری.....
202	اسماء ناہید	بیدر میں اردو شعروادب کا آغاز وارتقاء	جاری.....
203	فائزہ ناہید	صلاح الدین نیّر :شخصیت اورفن	2011
204	نکہت آرا شاہین	ڈاکٹر زورؔ کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	جاری.....
205	لئیق النساء	تلنگانہ کے دکنی اردو لوگ گیت	جاری.....
206	تحسین سلطانہ	دکنی ادب کی تحقیق وتنقید کے ارتقاء میں نورالسعید اختر کا حصہ	جاری.....
207	ڈاکٹر حمیرا تسلیم	اردو فکشن میں حیدرآبادی تہذیب کی عکاسی	2010
208	ڈاکٹر ایچ۔رئیس فاطمہ	دکنی کی منظوم داستانوں کا ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ	2011
209	فرزانہ بیگم	ہاشمی فریدآبادی: حیات اورادبی خدمات	جاری.....
210	آمنہ نصرت	انجمن ترقی ہند کے صدور کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
211	ظفر آمنہ	م۔ن۔سعید: شخصیت اور علمی وادبی خدمات	2010
212	غوثیہ بانو	عہد عثمانیہ میں انتظامیہ کے اصطلاحات کا لسانی تحقیقی جائزہ	2014
213	افضل بانو	علی عباس حسینی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	انتقال کرگئیں
214	تحسین النساء	اردو ناولوں میں عصری حسیت مسائل 1960ء کے بعد	جاری.....
215	عطیہ بیگم	اردو ناولوں میں تہذیبی تصادم ایک تنقیدی مطالعہ	جاری.....
216	عشرت سلطانہ	اردو اور ہندی کے افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں عورت کا تصور: ایک تقابلی مطالعہ	جاری....
217	شاہین	مثنوی ''سروشمشاد'' کی تدوین وتنقید	جاری.....
218	آمنہ بیگم	اردو میں تجریدی افسانہ	2014
219	افسری بیگم	جنوبی ہند میں خواتین کا غیر افسانوی ادب	جاری.....
220	اسماء فاطمہ	حیدرآباد میں اردو تحقیق کا ارتقاء 1980ء کے بعد	جاری.....
221	زرینہ خانم	اردو ناولوں کا نفسیاتی مطالعہ 1936ء کے بعد	2014
222	شاکرہ بیگم	پروین شاکر کی شاعری میں تصور حیات اور فنی جہت	جاری.....
223	ناظمہ بیگم	مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی وعلمی خدمات	جاری.....
224	عصمت النساء	اقبال مجید بہ حیثیت فکشن نگار	جاری.....
225	اسماء فضیلت	کرناٹک میں 1960ء کے بعد اردو غزل	جاری.....
226	ریشمہ خانم	ہندوستان میں سفرنامے آزادی کے بعد	جاری.....
227	نشاط بیگم	اردو انشائیہ روایت وامکانات	جاری.....
228	امتیاز فاطمہ	تذکرہ ضیغم ترتیب وتدون	جاری.....
229	تسلیم بیگم	دکن میں خاکہ نگاری آزادی کے بعد	جاری.....

230	راحلہ عشرت	اردو شاعری میں علامت نگاری کا رجحان	جاری.....
231	حنا کوثر	مابعد جدیدیت اردو ناول	جاری.....
232	احمدی فاطمہ	جدید غزل کا تشبیہاتی نظام	جاری.....
233	فاریہ امام	تلنگانہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل 1956ء کے بعد	جاری.....
234	انجم فاطمہ	مولوی عبدالحق کے مرتبہ دکنی متون کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	جاری.....
235	شیخ عائشہ	ابومحمد خالدی حیات اور ادبی خدمات	جاری.....
236	فریدالنساء بیگم	شکیب جلالی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	جاری.....
237	تسنیم	ڈاکٹر عبدالسلام کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
238	فریدہ تبسم	آغا حیدر مرزا کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
239	شکیب بانو	کالی داس گپتا رضا بحیثیت غالب شناس	جاری.....
240	شاہانہ مریم	اردو تنقید کا ارتقاء (1947-1990 نمائندہ نقادوں کے حوالے سے)	جاری.....

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایم۔فل کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
1	بدرالنساء	مولا موسوی کی مثنوی ''طالب ومونی'' اور میرؔ کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا تقابلی جائزہ	2009
2	سلطانہ بیگم	شب خون کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	2009
3	طلعت فاطمہ	خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کا تنقیدی جائزہ	2010
4	فہمینہ بیگم	شفیق فاطمہ شعریٰ کے کلام میں تلمیحات	2009
5	نشاط انجم	احمد مشتاق کی غزلوں کی کلیات	2008
6	عطیہ سلطانہ	ناول ''ابن الوقت'' میں تہذیبی کشمکش	2008
7	آصفہ پروین	حیدرآباد کرناٹک کی خواتین افسانہ نگار	2008
8	طاہرہ نورانی	شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں کا مجموعہ ''سرور'' اور دوسرے افسانوں کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ	2009
9	شبانہ بیگم	سعید محمد اشرف کے ناولٹ نمبردار نیلا کا تنقیدی وتجزیاتی جائزہ	2010
10	رافعیہ ولی	نذر سجاد حیدر کے ناول ''حرماں نصیب'' اور ''آہِ مظلوماں'' کا تنقیدی تجزیہ	2011
11	شمینہ بیگم	جنوبی ہند میں ڈھولک کے گیتوں کی روایت	مقالہ داخل
12	کیو۔صدیقہ	حیدرآباد کے دینی مدارس سے وابستہ اساتذہ کی علمی وادبی خدمات	جاری.....
13	سیدہ عروج فاطمہ	غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام میں مشترکہ مضامین کا تقابلی مطالعہ	جاری.....
14	رقیہ نبی	ناول مکان کا تانیثی جائزہ	مقالہ داخل
15	کوثر بیگم	پت جھڑ کی آواز کا تجزیاتی مطالعہ	جاری.....

پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات

سلسلہ نمبر	محقق کا نام	موضوع	سنہ ایوارڈ
16	بدرالنساء	دکنی کی رزمیہ مثنویاں تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	جاری.....
17	شمیم سلطانہ	بچوں کے ادب کی درجہ بندی عمر اور جماعت کے لحاظ سے	جاری.....
18	سلطانہ	رسالہ شب خون کے منتخب افسانوں کا تنقیدی جائزہ	جاری.....
19	طاہرہ نورانی	کرناٹک میں اُردو تعلیم وتدریس کی صورت حال تحتانوی تا فوقانی	جاری.....

Urdu Research Journal :Refereed Journal for Urdu
Vol.: II, Issue: I Jan.-March 2015

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی
خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونی ورسٹی، لکھنؤ

سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصنیفات پر ایک نظر

Sayed ashraf jahangeer ..... by Prof. S. Shafiq Ahmad Ashrafi, Urdu Research Journal, ISSN 2348-3687,
Vol. II, Issue: 1,Page No. 60-62

محبوب یزدانی حضرت مخدوم سید اوحد الدین اشرف جہانگیر سمنانی (پ ۶۸۸ھ۔م ۸۰۵ھ) کا شمار اپنے وقت کے جلیل القدر صوفیا میں ہوتا ہے۔آپ کا سلسلۂ نسب سمنان کے سلطان ابن سلطان ساداتِ نور بخشیہ سے جا ملتا ہے۔آپ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ مادرزاد ولی تھے۔قرآت سبعہ کے ساتھ آپ حافظ قرآن تھے۔چودہ سال کی عمر میں آپ نے تمام علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔آپ کی بڑائی، بزرگی اور مناقب کے بارے میں شیخ عبدالرحمان چشتی صاحب ''مرآۃ الاسرار'' رقم طراز ہیں: ''آن سلطانِ مملکت دنیاودیں، آں سرحلقۂ عارفانِ ارباب یقیں، آں محبّ ومحبوب ربانی، غوث الوقت حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ۔آپ یگانۂ روزگار تھے اور شانِ رفیع، ہمت بلند، کرامات وافر کے مالک تھے۔''

سید اشرف جہانگیر سمنانی حضرت شیخ علاالحق ہندوی ابن اسد لاہوری کے مرید وخلیفہ خاص تھے۔سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین چشتی محبوب الٰہی کے بعد چشتی سلسلۂ مشیخیت وہدایت کو آپ ہی نے از سرِ نو زندہ وتابندہ کیا۔محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کثیر التصانیف بزرگ گذرے ہیں۔مکتوبات اشرف، لطائف اشرف، شرح فصوص الحکم، علوم اشرفیہ، منادی اشرفیہ، ترجمان قرآن بہ زبان فارسی، رسالہ تصوف واخلاق، الرسالہ قبریہ، تفسیر نوربخشیہ، حجۃ الذاکرین، رسالہ غوثیہ، فوائد العقائد، دیوانِ اشرف، بحر الذاکرین، بشارت الاخوان، کنز الاسرار، رسالہ تحقیقاتِ عشق، اشرف الانساب، فوائد الاشرف وغیرہ آپکی اہم تصانیف ہیں۔

غوث العالم محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی سامانی ؒ کو رب تعالیٰ نے اپنی ملکیت میں تصرف کا اختیار عطا کیا ہے۔صاحبِ تصرف صوفیاء وہی ہوتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ مقامِ غوثیت سے سرفراز فرماتا ہے۔قرآن کریم کی یہ آیت ''یختص برحمتہ من یشائ'' ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کردیتا ہے۔ (سورۃ بقرۃ آیت ۱۰۵۔سورۃ آل عمران آیت ۷۴)

جب بندہ مقامِ قرب حاصل کرلیتا ہے تو رب تعالیٰ اس بندہ کو اذنِ عام عطا کرتا ہے۔پھر وہی بندہ اللہ کے حکم سے لوگوں کی دادرسی فرماتا ہے۔برگزیدہ صوفیوں کیلئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: ''رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ''۔ترجمہ: وہ مرد جنھیں غافل نہیں کرتا کوئی سودا اور نہ کوئی خرید وفروخت اللہ کی یاد سے۔

سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے معتقدین ومریدین سے فرمایا کہ بعض صوفیاء کرام کی صحبت حاصل کرو، بلکہ ایسے شیخ کامل کی صحبت اختیار کرو جو شریعت وطریقت کا جامع ہو اور حال وقال سے مزین ہو۔کیونکہ مریدین شیخ کے حال کا آئینہ ہوتے ہیں۔''شیخ کا حال'' بھی مریدین سے کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ہاں اگر مرید پر کوئی آسمانی حال وارد ہوا ہو جو مرید ہی کو نصیب ہوا ہو تو ایسی صورت میں بعض اوقات مرید اپنے شیخ کے درجہ سے بڑھ جاتا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور احسان ہے کہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مختص کردیتا ہے۔

حضرت مولانا نظام الدین یمنی نقل کرتے ہیں کہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی طواف خانہ کعبہ میں مشغول تھے کہ آپ نے دیکھا ایک شخص نہایت تیز روی کے ساتھ طواف خانۂ کعبہ کررہا ہے۔اور جب آدمیوں کے ہجوم سے گذرتا ہے بغیر کسی کو ہٹائے ہوئے ہوا کی طرح نکل جاتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس شخص کو جسم ہیں یا محض روح بشکل جسم نظر آتی ہے۔جب وہ طواف کرچکے تو میں نے ان کو سلام کیا۔انھوں نے سلام کا جواب دیا۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت آپ حضرت ابا بکر سبطی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت غوثِ زمانہ کون ہیں؟

فرمایا کہ میں ہوں۔اور میرے بعد سید جلال ہوں گے اور ان

کے بعد سید اشرف ہونگے۔

جس طرح غوث الاعظم محبوب سبحانی کے زمانہ ظہور سے قبل کے مشائخ نے آپ کے آنے کی بشارت دی اسی طرح حضرت محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ظہور سے پہلے کے اولیائے کرام نے آپ کے ورود مسعود یعنی ظاہر ہونے کی پیشین گوئی فرمائی۔ حضرت محبوب یزدانی اپنے مکتوب میں اس واقعہ کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ میرے جد حضرت سید شمش الدین محمود نور بخشی قدس سرہٗ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی۔۔۔۔چشتی کے زمانہ میں ہندوستان کی سیر کو تشریف لائے اور سلطان شمش الدین التمش کے گھر مہمان ہوئے سلطان موصوف جو قطب صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان سے تعریف کی کہ میرے گھر ایک مہمان سید عالی خاندان ملک ایران کے رہنے والے تشریف لائے ہیں۔ وہ مرتبۂ ولایت میں نقبا کے درجے کو پہونچے ہوئے ہیں۔ قطب صاحب نے فرمایا کہ ایسے مہمان عظیم الشان کو تم نے اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ ان کو ہمارے گھر ٹھہرانا چاہئیے تھا۔ میں تو ان کو خواجگانِ چشت سے سمجھتا ہوں۔

دوسرے دن حضرت سید شمش الدین محمود حضرت قطب صاحب کے گھر مہمان ہوئے۔ حضرت قطب صاحب نے سے فرمایا کہ میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ آپ کی ذریت میں ایک غوث جہانگیر پیدا ہونگے اور وہ میرے سلسلے کو جاری کریں گے اور خطہ یوض جس کو اودھ کہتے ہیں۔ اس میں کچھوچھہ حدود قصبہ جائس اور سترک سے لے کر پورب دریائے کوسی تک اس درمیان میں ان کا ظہور کامل ہوگا۔ حضرت محبوب یزدانی کا وجود مبارک باعث اجراء شریعت اور طریقت تھا۔ علم شریعت میں آپکے شاگردوں کی تعداد کثیر ہیں۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں حضرت علامہ ومولانا الشاہ سید عبدالرزاق نورالعین ابن سید عبدالغفور حسن جیلانی ابن ابوالعباس احمد جیلانی فرزند و صاحب سجادہ حضرت محبوب یزدانی تھے۔ انھوں نے تحصیل علوم کی تکمیل کے بعد حضرت سے دستار فضیلت حاصل کی۔ حضرت محبوب یزدانی کا علم عجیب خداداد تھا کہ روئے زمین میں جہاں تشریف لے گئے وہیں کی زبان میں وعظ فرمایا اور اسی زبان میں کتاب تصنیف کرکے وہاں کے لوگوں کیلئے علمی اثاثہ چھوڑ آئے۔ بہت سی کتابیں آپکی مختلف زبانوں میں ہیں مثلاً عربی، فارسی، سوری، ترکی، اردو، زنگی وغیرہ۔ آپنے مختلف ملکوں کی زبانوں میں تصنیف و تالیف فرمائی۔ حضرت محبوب یزدانی نے جس قدر تصانیف کثیرہ تحریر فرمائی ہیں وہ زمانہ کے دست و برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ''فقیر نظام یمنی نے دو جلدیں حضرت کے ملفوظات کتاب لطائف اشرفی اور کتاب الاسرار اور رقعات (مکتوبات) حضرت کے جمع کئے ہیں۔ محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کی چند تصانیف کا تعارف مختصراً پیش کیا جاتا ہے:

(۱) مکتوبات اشرفی: یہ مکتوب کا مجموعہ ہے اس کے اول مرتب اور جامع حضرت نظام الدین یمنی ہیں۔ جامع ثانی جانشین مخدوم اشرف سیدنا عبدالرزاق نورالعین ہیں۔ یہ مکاتیب محبوب یزدانی کا گراں قدر سرمایہ ہونے کے ساتھ قارئین کیلئے ذریعہ فلاح ونجات ہیں۔ مکتوبات اشرفی میں حق تعالی کی شانِ ربوبیت کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ تصوف کی رمزیت، ماہیت، حقیقت کو سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

اس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفہ کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ علما کے اصرار اور تقاضے پر بعض دقیق فقہی مسائل کے علاوہ صوفیانہ مسائل کی توجیہ، تعبیر اور تشریح مخصوص انداز سے کی گئی ہے مثلاً خواجہ خسرو، ابوسعید ابوالخیر، شیخ شرف الدین وغیرہ کے اشعار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مکاتیب دریائے معرفت کا دُرِ نایاب اور درجات عالیہ کے حصول کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

مکتوبات اشرفی کا مخطوطہ آج بھی تصوف کے دیوانوں اور خانقاہ کے سجادہ نشینوں کے پاس محفوظ ہے۔ کراچی پاکستان سے دو جلدوں میں مکتوبات اشرفی کا اردو ترجمہ سنہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم شاہ محمد ممتاز اشرفی ہیں۔ حالانکہ یہ ترجمہ مکتوب نگاری کی روح کی اصلیت سے دور ہے، پھر بھی مترجم کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔

لطائف اشرفی کے جامع حضرت نظام الدین یمنی ہیں جنھیں محبوب یزدانی کی خدمت وصحبت کا شرف زمانۂ دراز تک حاصل رہا ہے۔ لطائف اشرفی درحقیقت تصوف کی اہم کتابوں کا نچوڑ اور عطر ہے۔ اس کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تصوف کی دیگر کتابوں سے قاری کو بے نیاز کردیتی ہے۔ یہ حضرت محبوب یزدانی کی تعلیمات کا مظہر بھی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں اہل علم اس کتاب کو لکھ کر شاہی نذرانہ میں پیش کرتے تھے''۔ دنیا کے بیشتر قدیم اور عظیم کتب خانوں اور میرے پاس ایک ایک قلمی نسخے موجود اور محفوظ ہیں۔

لطائف اشرفی کے شروع میں مقدمہ ہے۔ آخر میں خاتمہ ہے اور ساٹھ لطائف ہیں جن کی تفصیل اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ چند لطائف کے نام ذیل میں اس طرح ہیں:

(۱) لطیفہ در بیان توحید۔ (۲) لطیفہ در بیان معرفت اور ولایت۔ (۳) لطیفہ در معرفت عارف وجاہل۔ (۴) لطیفہ در معارف صوفی و ملامتی و ذکر غوث و ابدال و اوتاد وغیرہ (۵) لطیفہ در معجزہ وکرامت و استدراج میں

فرق۔ (۶) لطیفہ در اہلیت شیخی مرشد و مرید کے آداب۔ (۷) لطیفہ در اصطلاحات تصوف۔ (۸) لطیفہ در حقیقت و معرفت و راہِ سلوک۔ (۹) لطیفہ در اذکار سکھانے کی شرطیں۔ (۱۰) لطیفہ در شرائط تفکر و مراقبہ۔ (لطیفہ در مشاہدہ و یقین وغیرہ۔

آپ کے عہد کے جلیل القدر علماء اور آپکے ارشد شاگردوں میں مولانا اعظم، حضرت مولانا علامہ الہدی علام الدین جائسی، حضرت مولانا عماد الدین ہروی وغیرہ کا نام آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسمائے الٰہی اور تسخیر کواکب میں حضرت نے کتاب تالیف فرمائی۔ حسب ارشاد امام عبداللہ یافعی اور بموجب بشارت روحانی حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف پر شرح لکھی۔ فصوص الحکم کی شرح بھی آپ نے روم کے زمانۂ قیام میں تصنیف کی۔ اور اس کتاب کو شیخ نجم الدین کے سامنے پیش کیا اور عرض کی کہ میں نے اس شرح کو بحکم روحانیہ پاک شیخ اکبر لکھا ہے۔

علم تفسیر میں کتاب تفسیر رنج سامانی اور کتاب تفسیر نور بخشیہ تصنیف فرمائی۔ جسمیں تصوف کے بیشتر مسائل مثل خواجہ روز بیان بقلیؒ بکمال خوبی درج کیے۔ اور کتاب فتاوائے اشرفیہ بزبان عربی محض بپاس خاطر مخدوم حضرت نورالعینؒ تحریر فرمایا۔ دراصل یہ کتاب فقہ کی مستند کتابوں کو انتخاب ہے اور یہ حنفی مسلک کے مطابق ہے۔ دیوانِ اشرف ایک مبسوط کتاب منظوم ہے۔ جس کو اہلِ زمانہ مثلِ دیوانِ حافظ لسان الغیب مانتے ہیں ۔حضرت نورالعین نے فرمایا کہ جس وقت امیر تیمور گورگانی، حضرت محبوب یزدانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ تفتمش خاں پر فوج کشی کرنا چاہتا ہوں حضور فال نیک دیکھ کر بتلایئے۔ حضرت کے سامنے آپ کا دیوان رکھا ہوا تھا اس میں فال دیکھی یہ شعر برآمد ہوا۔

از آیت وحدیث دوقرن اند بیقرانی اے بادشاہ کوش کہ صاحبِ قرآن شوی

لقب صاحبقرانی امیر تیمور کو محبوب یزدانی کے دیوان کے فال سے عطا ہوا۔ فال دیکھنے کے بعد حضرت محبوب یزدانی امیر تیمور کی فتح اور نصرت کیلئے فاتحہ پڑھی اور دست بدعا ہوئے۔ چنانچہ آپکی دعا کی برکت سے سلطان صاحبِ قران نے دشمن پر فتح حاصل کی۔

خاتمہ کتاب مکتوبات اشرفی میں حضرت نورالعین سے منقول ہے کہ حضرت محبوب یزدانی نے فرمایا کہ اس فقیر کو سند علم قرآت کی معناً پانچ پشتوں تک اپنے آبا و اجداد سے علی الاتصال پہونچی ہے۔ میرا عمل قرأت عاصم اور نافع پر ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میرے زمانۂ سلطنت میں میرے خاندانِ سادات نوربخشیہ سے ستّر حافظ قرآن اور قاری فرقان ایک زمانے میں موجود تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ غوث العالم حضرت محبوب یزدانی مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ایک عبقری شخصیت بن کر نمودار ہوئے اور اپنے علم و فضل، عمل و کردار، تصنیف و تالیف اور خدمت خلق اور خلق کی حاجت روائی کے سبب اور حضرت آدم کی اولاد کی آدمیت کو خالق سے ملانے اور اس کی بخشش و نجات کیلئے پُل کا کام کرنے اور سماجی ہم آہنگی کو قایم رکھنے کے سبب مرتبہ غوثیت تک پہنچے۔ آپ نے چشتی سلسلہ کا احیاء کیا اور ایک نئے سلسلہ سلسلۂ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی تعلیمات اور تصرفات کو مستحکم و عام کرنے کیلئے آستانہ روح آباد کچھوچھہ شریف کو مرکزی حیثیت عطا کی۔ آپ کا آستانہ آج بھی حاجت مندوں کے لئے باعث برکت و رحمت ہے۔

حوالہ جات:

مقالہ کی تکمیل کیلئے جن کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا وہ ذیل میں اس طرح ہیں۔

۱۔ مکتوبات اشرفی حصہ اول و دوم، مترجم: مولانا الشاہ سید محمد ممتاز اشرفی، مطبوعہ و ناشر: دارالعلوم اشرفیہ رضویہ گلشن بہار اورنگی ٹاؤن، کراچی: پاکستان: ۲۰۰۰ء

۲۔ صحائف اشرفی حصہ اول، مرتبہ: سید محمد علی حسین اشرفی میاں ، ناشر: ادارہ فیضان اشرف سنی دارالعلوم محمدیہ، ممبئی: ۱۹۹۶ء

۳۔ لطائف اشرفی جلد ہفتم، مترجم: حضرت مولانا محمود عبدالستار بھولے پور، ہنور۔ ناشر: دانش بکڈپو، ٹانڈہ امبیڈکر نگر۔ یوپی۔ مطبوعہ نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ: ۲۰۰۴ء

۴۔ رسالہ المیزان: صوفیا نمبر جلد اول زیر اہتمام: صوفی فاؤنڈیشن، انڈیا۔ ناشر: تنویر احمد اشرفی

☆☆☆☆

راجندر یادو کی منتخب کہانیاں

نام کتاب: راجندر یادو کی منتخب کہانیاں مرتب: راجندر یادو مترجم: ڈاکٹر ارشاد نیازی
صفحات:304 قیمت:250 ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا مبصر: عزیر اسرائیل

ڈاکٹر ارشاد نیازی ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک ناقد کی حیثیت سے انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ تفہیم شبلی، موازنۂ انیس و دبیر، مطالعہ، محاسبہ، تقابل اور توضیحات کے ذریعہ انہیں ادبی دنیا میں ایک پہچان ملی ہے۔ لفظوں کے صحیح اور برمحل استعمال کا فن انہیں جس طرح آتا ہے اردو کے کم ہی ناقدین ان کے ہم پلہ ہیں۔ غالباً لفظوں کی پرکھ اور ان کے برمحل استعمال کے فن نے انہیں ترجمہ کی دنیا میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا۔ اس لیے کہ ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں لفظوں کی پرکھ اور سوجھ بوجھ سب سے اہم ہے۔ ترجمہ کو عام طور پر ایک آسان فن تصور کیا جاتا ہے۔ واقعی یہ ایک آسان فن ہے لیکن ترجمہ کے فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وادی میں قدم رکھنے والوں کے لیے یہ واقعی ایک مشکل کام ہے۔ ترجمہ صرف ایک زبان سے دوسری زبان میں تحریر کو منتقل کرنے کا نام نہیں ہے۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اصل کتاب کی روح ترجمہ کے عمل سے گزر کر قاری کے سامنے آجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بہترین مترجم کی جملہ خصوصیات ڈاکٹر ارشاد نیازی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے حال ہی میں دو کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ سنسکرت کی مشہور زمانہ کتاب 'ہتوپدیش' اور راجندر یادو کی منتخب کہانیاں'۔ یہاں پر صرف آخرالذکر کی بات کی جائے گی۔

یہ کتاب ہندی ماہنامہ ہنس کے مدیر راجندر یادو کی کہانیوں کے انتخاب کا ترجمہ ہے۔ یہ انتخاب خود راجندر یادو نے کیا تھا۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ اس انتخاب میں کل اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ اس میں سے بعض بہت طویل اور بعض ایک صفحہ سے بھی کم مثلاً 'ماں کی کمر' جو کہ چند سطور پر مشتمل ہے۔

راجندر یادو کی ان کہانیوں پر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں صرف کہانی سنانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ وہ ہمیں اس ماحول کا حصہ بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ کہانی اور اس کے کرداروں سے جڑی ہر اس چیز کو قاری کو بتانا چاہتے ہیں جو ان کی نظر میں کہانی کو حقیقت سے قریب کردے۔ اس کے لیے وہ جزئیات کا سہارا لے لیتے ہیں۔ یہ جزئیات نگاری بعض دفعہ قاری اور کہانی کے درمیان ایک برزخ کی شکل میں بھی ظاہر ہوتے ہیں جسے قاری کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ترجمہ کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اصل لگنے لگے۔ ارشاد نیازی کے ترجمہ کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اصل کتاب کو پڑھ رہے ہیں۔ کہیں بھی ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا ہے۔ جملوں کی روانی میں کہیں بھی فرق نہیں ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

'اچانک چونک کر اس نے میرا کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے کچھ کہا ہے، ''کچھ کہہ رہی تھیں کیا؟
'میں؟.....نہیں تو۔'' پھر وہی سکوت اور اداسی کی چادر۔
محسوس ہوا، جیسے کوئی مردہ لمحہ ہے جس کا ایک سرا میرا پکڑے ہے اور دوسرا وہ۔ اور اسے خاموشی سے دونوں رات کے سناٹے میں کہیں دفنانے جارہے ہیں..... ڈرتے ہیں کہ کسی کی نگاہ نہ پڑجائے۔ کوئی جان نہ لے کہ وہ قاتل ہیں..... کہیں کسی جھاڑی کے پیچھے اس لاش کو پھینک دیں گے اور خوشبودار رومالوں سے کس کر خون پوچھتے ہوئے چلے جائیں گے بھیڑ میں کھو جائیں گے..... جیسے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے میں ڈر لگتا ہے۔ ..... کہیں الزام تراشی کرتی آنکھیں اقبال جرم کرنے کو مجبور نہ کردیں.....'' (چھوٹے چھوٹے تاج محل)

''اور کنجوسی کی حد تو آپ نے دیکھ ہی لی ہوگی! بڈھا ہوگیا ہے۔ 'سانس کا مرض ہورہا ہے'۔ سارا بدن کانپتا ہے لیکن ایک پیسے کا بھی فائدہ دیکھے گا تو دس میل دھوپ میں پیدل ہانپتا ہوا چلا جائیگا۔ کیا مجال جو سواری کرلے۔ گرمی آئی تو سارا جسم برہنہ کمر میں دھوتی۔ آدھا پہنے، آدھا لپیٹے۔ جاڑے میں یہی لباس، بس اسی میں پچھلے دس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کسی مکان کی مرمت، سفیدی صفائی نہ کرانا اور ہمیشہ دھیان دینا کہ کون کتنی بجلی خرچ کررہا ہے۔ کہاں بیکار پنکھا اور نل چل رہا ہے۔ لڑکا ہے تو اسے مفت چنگی کے اسکول میں ڈال دیا ہے۔ لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے۔'' (جہاں لکشمی قید ہے)

مذکورہ بالا دونوں اقتباس میں نے دو الگ کہانیوں سے لیا ہے۔ ان نمونوں کو دیکھ کر ارشاد نیازی کے ترجمہ کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کہیں بھی ایسا نہیں محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ ہے۔ اگر راجندر یادو ان کہانیوں کو اردو میں لکھتے تو شاید انہیں الفاظ میں لکھتے۔

راجندر یادو کی کہانیوں کا یہ انتخاب اردو میں شائع کرکے نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے اردو برادری پر احسان کیا ہے۔ اس کی روشنی میں اردو ناقد اور افسانہ نگار اپنی کہانیوں کے معیار کو جانچ پرکھ سکتے ہیں۔

☆☆☆